جس میں اس کے اہم اصول و شرائط اور تفسیر میں غلطی کے اسباب بیان کیے گئے ہیں، مذکورہ بالا رسالہ اسی کا اردو ترجمہ ہے، اس میں دکھلایا گیا ہے کہ تفسیر کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ قول رسول اور مفسر قرآن صحابہ اور تابعین کے اقوال کی روشنی میں کیجائے، چنانچہ عہد سلف میں جب تک اس کا لحاظ رہا تفسیری اختلافات بہت کم پیدا ہوئے اور ان کی نوعیت بھی بہت خفیف تھی، پھر جب اس اصول سے ہٹ کر تفسیر بالرائے شروع ہوئی تو اختلافات بڑھتے گئے، اور اسکی نوعیت بھی سنگین ہوتی گئی حتی کہ بدعتی فرقوں نے رکیک تاویلوں سے آیات قرآنی کا مفہوم ہی بدل دیا، اس کی وضاحت مثالوں سے کی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں تفسیری احادیث و روایات پر تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے رد و قبول کے اصول بتلائے گئے ہیں، اور تفسیری اغلاط کے اسباب میں بدعتی فرقوں کی تفسیروں سے استدلال کی غلطیاں واضح کی گئی ہیں، پھر تفسیر کا صحیح طریقہ بتلایا گیا ہے، یہ اس رسالہ کے مباحث کا اجمالی خاکہ ہے، اور اس کی تفصیل میں تفسیر کے تمام اہم اصول و شرائط آگئے ہیں، یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے مگر بہت مفید ہے، اس کے ناشر جناب مولوی عطاء اللہ صاحب نے حواشی میں رسالہ کے اجمالی اشارات کی تشریح کر دی ہے، جو بہت مفید ہے، ترجمہ کی خوبی کے لیے فاضل مترجم کا نام کافی ہے،

کشت خیال ۔ از جناب رضی احمد صاحب رضی، تقطیع جیبی، ضخامت ۸۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت قسم اول عہ، دوم عہ، پتہ سید ذکی احمد، ٹیڑھی گھاٹ پٹنہ سٹی۔

مصنف بہار کے خوش مذاق شاعر ہیں، کشت خیال ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے، چند قطعات بھی ہیں، مجموعہ کی ترتیب تاریخ وار ہے جس سے عہد بعہد کی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے، ابتدائی کلام میں قدرۃً خامی ہے، مگر آخری دور کے کلام میں خیالات اور طرز ادا دونوں میں پختگی نمایاں ہے اور کلام کا عام رنگ ستھرا ہے،

"م"

جلد ۷۷ ماہ جمادی الثانی ۱۳۷۵ھ مطابق فروری ۱۹۵۶ء عدد ۲

فہرست مضامین

شذرات

جلالۃ الملک سلطان سعود بن عبد العزیز خلد اللہ ملکہٗ نے ہندوستان میں اپنی دینی حمیت، اہتمام شریعت اور شاہانہ فیاضی کے جو پائندار نقش چھوڑے ہیں وہ تاریخ میں یادگار رہیں گے، اور اس زمانہ میں اسکی مثال نہیں مل سکتی، آجکل کی سرکاری تقریبات میں وہ بھی ایک غیر مذہبی حکومت میں اوامر و نواہی کی پابندی بہت دشوار ہے، خصوصاً نواہی سے دامن بچانا تو تصور میں نہیں آسکتا، مگر سلطان نے عملاً ثابت کر دیا کہ اگر انسان کے دل میں مذہب کا سچا جذبہ ہو تو وہ ہر ماحول میں اس کے احکام پر عمل کر سکتا ہے، دوسری طرف ایک آزاد حکومت کے خود مختار فرمانروا کی حیثیت سے انھوں نے جس شاہانہ فیاضی کا مظاہرہ کیا اسکے واقعات صرف تاریخوں میں پڑھے تھے، اسکی عملی مثال پہلی مرتبہ دیکھنے میں آئی، اس فیاضی سے دار المصنفین بھی محروم نہ رہا، اور سلطان نے اسکو دس ہزار کا گرانقدر عطیہ مرحمت فرمایا، جسکے لیے ارکان دار المصنفین سراپا سپاس ہیں، اس عطیہ میں مجلس دار المصنفین کے صدر ڈاکٹر سید محمود نائب وزیر خارجہ حکومت ہند کی توجہ کو خاص دخل ہے، اسلیے کارکنان دار المصنفین ڈاکٹر صاحب ممدوح کے بھی شکرگذار ہیں۔

~~~~~~~~~~~~

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ ہماری پرانی علمی و تہذیبی بزم کی ایک اور روشن شمع خاموش ہوگئی، اور قاضی عبد الغفار صاحب نے موت و حیات کی طویل کشمکش کے بعد، ار جنوری کو انتقال کیا، وہ ہماری بزم کہن کی اہم یادگار، حکیم اجمل خاں کے ندیم خاص، مولانا محمد علی کے ہمدم و ہمراز، مولانا ابو الکلام کے ہمنشین، ایک تجربہ کار صحافی اور صاحب طرز ادیب تھے، چمنستان ادب اور خار زار صحافت دونوں میں ان کے قلم کی روانی یکساں تھی، اور طنز لطیف میں تو آپ اپنی مثال تھے، ہماری زبان میں ان کے ہلکے ہلکے اشارے "طنز و ظرافت" کے شرارے اور اردو ادب کے شہ پارے ہوتے تھے،

~~~~~~~~~~~~

وہ پرانے قوم پرست اور وطن پرور تھے، ترک موالات اور خلافت کی تحریکوں میں سرگرمی سے حصہ لیا، اس کے بعد بھی صحافت کے دائرے کے اندر ایک عرصہ تک ملکی سیاست میں حصہ لیتے رہے اور مختلف اوقات میں کلکتہ، دہلی اور حیدر آباد سے مختلف اخبارات جمہور، صباح اور پیام نکالے، ہمدرد میں مولانا محمد علی مرحوم کے دست راست تھے، ۱۹۲۲ء میں دوسرے وفد خلافت کے سکریٹری کی حیثیت سے لندن گئے تھے، انکی کتاب نقش فرنگ اس سفر کا دلآویز مرقع ہے، وہ فطری ادیب تھے، ان کی کوئی تحریر ادب کی چاشنی سے خالی نہ ہوتی تھی، انجمن ترقی اردو کے دوبارہ قیام کے بعد اس کے جنرل سکریٹری ہو گئے تھے، بلکہ پہلی انجمن کے خاتمہ کے بعد دوبارہ انہی نے اس کو زندہ کیا تھا، اور اسکے ذریعہ آخر دم تک اردو کے لیے لڑتے رہے، اس صوبہ میں اردو کو جو حقوق بھی ملے ہیں اس میں انجمن کو بڑا دخل ہے،

قاضی صاحب میں جدت و قدامت کا بڑا لطیف امتزاج تھا، وہ خیالات میں ترقی پسند تھے لیکن تہذیب و معاشرت میں پرانے مشرقی آداب کے پابند اور قدیم تہذیب و شرافت کا بڑا دلکش نمونہ تھے، انکی ہر چیز میں ایک خاص قسم کا سلیقہ، شائستگی اور نفاست تھی جس کا اثر ان کی تحریروں میں بھی تھا، چنانچہ انکی کوئی تحریر ادبی لطافت سے خالی نہ ہوتی تھی، اسی لیے ادب میں ترقی پسندی کے باوجود وہ ترقی پسند ادیبوں کی بے اعتدالیوں کو پسند نہ کرتے تھے، انکی زندگی کا بڑا حصہ زبان و ادب کی خدمت میں گذرا اور اسی پر انکا خاتمہ ہوا، انکی تصانیف نقش فرنگ، حیات اجمل، آثار جمال الدین افغانی، آثار ابو الکلام آزاد، لیلی کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں، اور جب تک اردو زبان باقی ہے ان کا نام زندہ رہے گا، قاضی صاحب مرحوم کا بدل پیدا ہونا بہت مشکل ہے، اللہ تعالیٰ ان کو عالم آخرت کی مقبولیت سے سرفراز فرمائے۔

~~~~~~~~~~~~

اس صوبہ میں اردو کو علاقائی زبان بنانے میں حکومت کو ایک عذر یہ بھی تھا کہ اس سے انتظامی دشواریاں پیدا ہوں گی، مگر اب ریاستوں کی تقسیم کا جو نقشہ بن رہا ہے اس میں دو کیا بعض بعض صوبوں میں تین تین علاقائی زبانیں ہوں گی، اور دہلی میں اردو کو علاقائی زبان تسلیم کر لیا گیا ہے، اس کے بعد انتظامی
~~~~~~~~~~~~

دشواری کا عذر محض عذر لنگ ہو جاتا ہے، ابھی حال ہی کی ایک تقریر میں پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک مرتبہ پھر اردو کی پرزور حمایت کی ہے اور نہایت صریح الفاظ میں اسکی حیثیت واضح کردی ہے، ان تمام باتوں نے بڑی حد تک اردو کے لیے راستہ صاف کردیا ہے اور اب ہٹ دھرمی کے سوا اردو کو اس صوبہ کی علاقائی زبان بنانے میں کوئی امر مانع نہیں ہے، اس لیے بہتر شکل یہی ہے کہ اردو کو دہلی کی طرح اس صوبہ کی بھی علاقائی زبان بنادیا جائے، اسکے علاوہ اس مسئلہ کا اور کوئی حل نہیں ہے، محض جزوی حقوق و مراعات دینے سے اور زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہونگی،

~~~~~~~~~~

۵ رفروری کو شبلی کالج کے خطبۂ تقسیم اسناد کے لیے سر سیتا رام صاحب تشریف لائے تھے، ان کا قیام دار المصنفین میں تھا، موصوف پرانی مشترک تہذیب کی یادگاروں میں ہیں، اس لیے اردو اور فارسی کا ستھرا مذاق رکھتے ہیں، اسلامی لٹریچر سے بھی ان کو واقفیت ہے، چنانچہ اپنے خطبۂ صدارت میں بھی انھوں نے مولانا شبلی اور دار المصنفین کے علمی خدمات کا تذکرہ کیا، مختلف ادبی اور لسانی مسائل پر ان سے گفتگو رہی، دار المصنفین اور اس کا کتب خانہ دیکھکر خاص طور سے متاثر ہوئے، اس زمانہ میں جو پرانی یادگاریں باقی رہ گئی ہیں، وہ بہت غنیمت ہیں، آئندہ ایسے نمونے دیکھنے میں نہ آئیں گے،

~~~~~~~~~~

المنتدی العربی لکھنؤ کی جانب سے کئی مہینہ سے عربی کا ایک ماہنامہ رسالہ البعث الاسلامی مولانا ابوالحسن علی ندوی کی نگرانی میں نکل رہا ہے، اس کا مقصد عربی کی تعلیم اور انکے طلبہ میں دینی روح، عربی زبان و ادب کا صحیح ذوق اور عربی دنیا سے ثقافتی تعلقات پیدا کرنا ہے، مولانا ابو الحسن علی ندوی کی نگرانی اسکی دینی اور ادبی حیثیت کی پوری ضمانت ہے، اس رسالہ کا تعلق اگرچہ دار العلوم ندوۃ العلماء سے براہ راست نہیں ہے، لیکن اس کے عملہ ادارت کے تمام ارکان اور مضمون نگار ندوی اہل قلم اور ندوے کے متوسلین ہیں، اسلیے درحقیقت یہ اسی شجر علم کا ثمرہ ہے یہ رسالہ اپنے مقاصد کے لحاظ سے اس لائق ہے کہ اسکو زندہ رکھا جائے اور اسکی صرف یہ صورت ہے کہ عربی زبان کے قدردان اس کے خریدار بنکر عملی ہمدردی کا ثبوت دیں، اسکی سالانہ قیمت بھی بہت کم صرف صر ہے بیرون ہندوستان کے خریداروں کیلیے محصولڈاک اسکے علاوہ ہوگا، ملنے کا پتہ یہ ہے، رسالہ البعث الاسلامی، ۳۰ گوئن روڈ لکھنؤ،

مقالات

تاریخ اسلام کا مُطالعہ

از

جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی (لندن) صدر شعبۂ عربی و اسلامیات

گورنمنٹ کالج، لاہور

ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب معارف کے پرانے مضمون نگار ہیں، مگر ہندوستان کی تقسیم کے بعد اسکی پرانی علمی بزم کا شیرازہ کچھ ایسا منتشر ہوا کہ ڈاکٹر صاحب مدتوں کے بعد بزم معارف میں شریک ہو سکے، اور امید ہے کہ وہ آیندہ اس طویل غیر حاضری کی پوری تلافی کریں گے۔ انھوں نے اس مضمون میں ایک اہم علمی و ملی ضرورت کی طرف توجہ دلائی ہے، اور تاریخ اسلام اور اسلامی ہند کی تاریخ کے مطالعہ کے سلسلہ میں جو قیمتی مشورے دیے ہیں، ان میں بڑی حد تک دار المصنفین کے خیالات کی ترجمانی کی ہے، دار المصنفین میں اس موضوع پر اب تک جو کام ہوا ہے اور آیندہ جو کام پیش نظر ہیں، ان میں ڈاکٹر صاحب کے پیش کردہ بیشتر پہلو شامل ہیں، جس کا اعتراف ڈاکٹر صاحب نے بھی کیا ہے، خصوصاً اسلامی ہند کی تاریخ کے کاموں میں خاص طور سے اس کا لحاظ رکھا گیا ہے جس کا اجمالی خاکہ اکتوبر کے معارف میں شائع ہوا ہے۔ "م"

ملت اسلام کے لیے اسلامی تاریخ اور اسلامی روایات کا علم بمنزلہ قومی حافظہ کے ہے، جس طرح

ایک فرد کی شعوری زندگی اور اس کا تسلسل، اس کے حافظہ کی سلامتی پر موقوف ہے، اسی طرح اہل اسلام کا تمام نظامِ زندگی اپنی قومی تاریخ اور ملّی روایات سے وابستہ ہے، ملت بیضا، اپنی سرگذشت ہی کے ذریعہ سے اس امر سے آگاہ ہو سکتی ہے کہ اس کی ابتدا کیسے ہوئی اور وہ کن مرحلوں سے گذر کر اپنی موجودہ منزل پر پہنچی ہے۔ لہذا حالات حاضرہ کا صحیح جائزہ لینے اور موجودہ مسائل کو بخوبی سمجھنے کے لیے از بس ضروری ہے کہ ہم گذشتہ زمانے کا بغور مطالعہ کریں اور اس بات کو دریافت کریں کہ وہ دینی عقائد اور اخلاقی اصول جو ہماری سیرت اور ہمارے کردار پر اثر انداز ہو رہے ہیں اور وہ رسوم و آداب جن کے ہم پابند ہیں، کیسے معرض وجود میں آئے، ان میں عہد بعہد کیا تبدیلیاں ہوئیں اور انھوں نے اپنی موجودہ صورت کیسے اختیار کی،

اگر اہل اسلام اپنی قومی تاریخ کو بھول جائیں اور اپنے شاندار ماضی کو فراموش کر دیں تو ان کی مثال اس بھولے بھٹکے مسافر کی سی ہو جائے گی، جو ایک دن ایسی حالت میں بیدار ہوتا ہے کہ اس کا حافظ اس کو جواب دے چکا ہے، اور وہ نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے، کہاں سے آیا ہے اور اس کی منزلِ مقصود کون سی ہے۔

تاریخ اسلام سے ہماری مراد محض داستان سرائی نہیں، جن سے دوسروں کی تفریح طبع یا گرمی محفل مقصود ہو، بلکہ اس کے مقاصد بہت بلند ہیں۔ اس کا مطالعہ نہ صرف اخلاقی تربیت اور قومی جذبہ کی استواری کے لیے ضروری ہے، بلکہ تاریخی معلومات دورِ حاضر کے مذہبی، معاشری اور اقتصادی مباحث کی توضیح کے لیے بھی بہت ضروری ہیں، اور مشکل مسائل کی گتھی سلجھانے میں بہت مفید ہو سکتی ہیں۔ اکثر اوقات دیکھا گیا ہے کہ لوگ جب کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں تو اپنے دعویٰ کے اثبات میں تاریخی واقعات پیش کرتے ہیں، جب کبھی کوئی اصلاحی تحریک شروع ہوتی ہے تو اس کی تائید میں بھی تاریخی شواہد ہی پیش کیے جاتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر واقعات کو ہمیشہ صحت اور

سچائی کے ساتھ اپنے اصلی رنگ میں پیش کرنا چاہیے، اور یہ بات صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ تاریخ کا مطالعہ محققانہ کاوش اور کمال دیانتداری سے کیا جائے۔

اہل اسلام نے تہذیب و تمدن کی ترقی میں ایسا شاندار حصہ لیا ہے، جس پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اگرچہ مغربی اقوام کے مقابلہ میں وہ اپنی سابقہ عظمت اور برتری ایک حد تک کھو بیٹھے ہیں، مگر ان کیلئے یہ امر بدستور باعث ناز ہے کہ وہ صدیوں تک دنیا میں علم و حکمت، تہذیب و تمدن اور اعلیٰ اوصاف کے علمبردار رہے ہیں، اور انھوں نے جریدۂ روزگار پر اپنی عظمت اور شائستگی کے ایسے گہرے نقش چھوڑے ہیں جن کو زمانے کا ہاتھ کبھی محو نہیں کر سکتا، مسلمانوں کو عالیشان روایات کی وہ بیش بہا میراث ملی ہے، جس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانا مشکل ہے، وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات اور ایک عظیم الشان تہذیب کے وارث ہیں۔ اسلامی تہذیب کی بنیاد ویسے اعلیٰ اخلاقی اصول اور عمدہ تمدنی اصول پر قائم ہوئی ہے، جس سے نوع انسان نے ماضی میں زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی حاصل کی ہے، اور جو اب بھی ان کے لیے مشعل راہ کا کام دے سکتے ہیں۔

انڈو مسلم کلچر

زمانہ حال کی ایک شدید قومی ضرورت یہ ہے کہ مسلمان اپنی تاریخ اور تمدنی سرگذشت کو دنیا کے سامنے اپنے اصلی اور صحیح رنگ میں پیش کریں۔ تاریخی تحقیقات کے لیے ایک وسیع میدان موجود ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ تاریخی مذاق رکھنے والے نوجوان کمر ہمت باندھ کر میدان تحقیق میں اتریں اور اپنی تاریخ کے ضخیم دفاتر کی ورق گردانی کر کے ان محاسن کی نقاب کشائی کریں، جو ہمیشہ سے اسلامی تہذیب کے لیے طرۂ امتیاز رہے ہیں۔ تاکہ دوسری قوموں کو اپنے علمی اور تمدنی کارناموں سے آگاہ کر سکیں اور خاص کر ہندوستان کی تہذیب و ترقی میں مسلمانوں نے جو شاندار حصہ لیا ہے، اس کا حال سب پر روشن کر سکیں۔ اگرچہ ہندوستان میں اسلامی سطوت کی داستان تاریخ اسلام کا محض ایک باب ہے، مگر وہ غیر معمولی جاذب

اور غیر فانی کارناموں سے معمور ہے، اور ایک محقق کے لیے غایت درجہ کی دلچسپی کا موجب ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ اس جزو کو کل کی روشنی میں مشاہدہ کیا جائے یعنی ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ کا دیگر اسلامی ملکوں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ مطالعہ کیا جائے، تاکہ ان کے باہمی روابط کی توضیح سے اسکی تحریر اور تعبیر میں فلسفیانہ رنگ پیدا ہو سکے۔

ایک لحاظ سے اسلامی تاریخ کا مطالعہ ہندوستان کی دوسری قوموں کے لیے بھی خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اسلام نے بحیثیت ایک دین اور ضابطۂ اخلاق کے ہندوستانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں بڑا نمایاں حصہ لیا ہے، اس کے مذہبی اور تمدنی اثرات کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کی ابتداء، اس کی حیرت انگیز اشاعت کے وجوہات اور اسلامی مملکت کی توسیع و ترقی کے اسباب پر غور کیا جائے اور اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ کس طرح ساتویں صدی مسیحی میں کاروانِ اسلام صحرائے عرب سے نکلا اور منزلیں طے کرتا ہوا دریائے گنگا کے کنارے اترا، اور پھر کس طرح اس کی ایک شاخ بنگالہ کے مرغزاروں میں اور دوسری دکن کی وادیوں میں خیمہ زن ہوئی۔ ان حیرت انگیز فتوحات کا جائزہ لینے اور ہندوستانی زندگی پر اس کے گوناگوں اثرات کا سراغ لگانے کی ایک ہی صورت ہے کہ ابتدائے اسلام اور مشرقی اسلامی ملکوں کے باہمی تعلقات پر پورا عبور حاصل ہو کیونکہ یہی وہ پس منظر ہے جسکی روشنی میں ہم ہندوستان کے گذشتہ ہزار سالہ تاریخی ارتقاء کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ ایک دوسرے کی تاریخ کا منصفانہ مطالعہ ہندوستان کی مختلف قوموں اور ملتوں میں باہمی مفاہمت اور اعتماد کی فضا پیدا کر سکتا ہے، اور ان کو ایک دوسرے کا ہمدرد اور غمگسار بنا سکتا ہے۔ اگر ہم اس ملک میں شفیق بھائیوں اور بامروت ہمسایوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں، تو ہمارے لیے مدارات اور مسامحت ضروری ہے، اور یہ بات اسی

صورت میں ممکن ہے کہ ہم ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھیں، ایک دوسرے کے مذہبی نصب العین اور اصولِ زندگی سے واقف ہوں اور ایک دوسرے کے اوصاف اور محاسن کا فیاضی اور فراخ دلی سے اعتراف کریں۔

ہماری فرقہ وارانہ مغایرت اور منافرت کا ایک قوی سبب یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کی تاریخ، ثقافت اور ادبیات سے ناواقف ہیں اور اسی ناواقفیت کی بناء پر باہمی معاملات میں تعصب اور تنگ نظری سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ سر تیج بہادر سپرو آنجہانی نے ۱۹۳۵ء میں یو۔پی اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے خطبۂ صدارت میں اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا اور افسوس کے ساتھ کہا تھا کہ

"کچھ عرصہ سے ہم میں ایک خوفناک مرض پیدا ہو گیا ہے، جو اخبارات اور سیاسی لیڈروں تک محدود نہیں، بلکہ بدقسمتی سے علمی اور تعلیمی حلقوں میں بھی سرایت کر چکا ہے، اور وہ مرض یہ ہے کہ ہم کلچرل معاملات میں بھی تنگ نظری اور فرقہ پرستی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور تاریخ کی تعبیر و تشریح میں علمی اصول کو پیش نظر رکھنے کے بجائے پہلے ہی سے مخالفانہ رائے قائم کر لیتے ہیں، اور تاریخ کی اصلی روح اور اس کے ماحول کو نظرانداز کرتے ہوئے محض تخیل کی رنگ آمیزی اور ذہانت کی ملمع کاری سے کام لیتے ہیں۔"

لہٰذا ہمارے تاریخ نگاروں کو چاہیے کہ وہ عصبیت اور جانبداری کے جذبات سے پاک ہو کر تاریخ پر منصفانہ اور محققانہ نگاہ ڈالیں اور تاریخی واقعات کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کریں۔

"انڈو مسلم کلچر" جو ہندوستان جنت نشان کی سرزمین میں پھلی پھولی، دنیا کی بہترین تہذیبوں میں شمار ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا منصفانہ مطالعہ ہمارے درمیان باہمی احترام کے جذبات پیدا کرے گا اور ہمارے تعلقات کو خوشگوار بنانے میں ممد و مددگار ثابت ہوگا۔

مروجہ اسلامی تاریخیں عمدہ تاریخ نگاری کے جو مسلّمہ اصول ہیں، ان کے معیار پر اردو زبان کی بہت کم تاریخی کتابیں پوری اترتی ہیں، اکثر اسلامی تاریخوں کو جو آجکل مروج ہیں، جنگ نامے کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ان میں حکمرانوں کے ذاتی حالات، ان کی فتوحات، درباروں کے لوازمات، کشورکشائی کی جزئیات، درباروں کی سازشوں، امراء اور سپہ سالاروں کی بغاوتوں کو اس تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے کہ باقی امور کے لیے بہت کم گنجائش رہ جاتی ہے۔ ان تاریخوں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ محل شاہی کے باہر کیا ہو رہا تھا، عام لوگوں کی زندگی کیسی تھی، ان کے کون کون سے طبقات تھے، ان کے باہمی تعلقات کی نوعیت کیا تھی، ان کی اقتصادی حالت کیسی تھی یعنی وہ کن ذرائع سے روزی کماتے تھے، ان کے ہاں کون کون سی دستکاریاں اور صنعتیں رائج تھیں، زراعت اور تجارت کا کیا حال تھا، ان کے عقائد اور اصول اخلاق کیا تھے اور رسوم و عادات کی کیا صورت تھی، انھوں نے کس قسم کا لٹریچر پیدا کیا اور وہ کس حد تک ان کی زندگی اور ان کے قومی مزاج کا آئینہ دار ہے، ان کے علوم و فنون کس درجہ پر تھے، تعلیم و تدریس کا کیا طریق تھا، انھوں نے کن علوم کے ساتھ خاص اعتنا کیا اور کیوں؟ اپنے ہمسایہ ملکوں اور ہمعصروں کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے تھے، وغیرہ وغیرہ۔ متداول تاریخی کتابوں کے ناقص ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا عنوانوں پر کافی مواد نہیں ملتا، اور اگر کہیں ملتا ہے تو اس سے کام نہیں لیا جاتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اکثر مروجہ تاریخیں گذشتہ زمانے کی ادھوری اور بگڑی تصویر پیش کرتی ہیں۔

تاریخ اسلام کی مروجہ کتابوں کی ایک اور خامی یہ ہے کہ ان کا تنقیدی پہلو بہت کمزور ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو تاریخ نویسی نے گذشتہ صدی میں جس دور میں جنم لیا اس وقت مسلمانوں کے مذہب، ان کے تمدن اور ان کی تاریخ پر مختلف اطراف سے

شدید حملے ہو رہے تھے۔ اس جارحانہ کارروائی میں عیسائی مشنری اور برطانوی مورخ پیش پیش تھے۔ عیسائی مشنری اپنی تالیفات میں اور اپنے مناظروں میں مذہب اسلام، پیغمبر اسلام اور تاریخ اسلام سبھی پر زبان طعن دراز کر رہے تھے۔ اُدھر انگریز مورخوں کی بھی یہی کوشش تھی کہ اسلامی عہد کو تاریک دکھایا جائے تاکہ سرکار انگلشیہ کی برکات روز روشن کی طرح واضح ہو سکیں۔ ان حالات میں ایک مسلمان مورخ جب کبھی قلم اٹھاتا تو وہ مدافعانہ پہلو اختیار کرتا اور اپنی قومی تاریخ کو بہترین جامہ پہنانے کی کوشش کرتا، نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اردو زبان میں ابھی تک ناقدانہ تاریخ نویسی پیدا نہیں ہو سکی اور مسلمان پبلک اپنے ماضی کے بارے میں اتنی حساس بن گئی ہے کہ وہ تنقید کا ایک حرف بھی سننے کے لیے تیار نہیں، خواہ وہ تنقید کتنی نیک نیتی سے کیوں نہ کی جائے۔

پھر بھی قوم میں ایک حد تک تاریخی مذاق موجود ہے، اس لیے ان تمام نقائص اور موانع کے باوجود اردو زبان میں علم تاریخ کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس فن میں بہترین تالیفات وہ ہیں، جو علامہ شبلی مرحوم اور ان کے دبستان کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ ان میں اس امر کی اصولاً کوشش کی گئی ہے کہ تمام واقعات کو اصلی اور مستند مصادر سے اخذ کیا جائے، معاشرت اور تہذیب و تمدن کے متعلق نئے نئے عنوانات قائم کیے جائیں، سیاسی تاریخ کے ساتھ علمی اور تمدنی تاریخ بھی قلمبند کی جائے، اور تمام فراہم کردہ معلومات کو مصادر کے حوالوں سمیت سلیقہ اور قرینہ کے ساتھ ترتیب دیا جائے۔

تاریخی ناول کی وباء اردو زبان میں تاریخی ناول کا جو روز افزوں رواج ہو چلا ہے، وہ قوم کے حق میں نہایت ضرر رساں بلکہ مہلک ہے۔ میں ناول نویسی کا مخالف نہیں، وہ بھی ادب کی ایک شاخ ہے جس میں انسانی کردار اور معاشرت کے مختلف پہلوؤں کو ایک خیالی کہانی یا

افسانہ کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ مگر جب قومی تاریخ کو ناول کی صورت دے دیجاتی ہے۔
یعنی قومی تاریخ کو افسانہ کے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے، جس میں تاریخی واقعات اور من گھڑت
باتوں میں کسی قسم کا فرق و امتیاز باقی نہیں رہتا تو اس سے نہ صرف علم تاریخ کے ساتھ انتہائی
بے انصافی ہوتی ہے، بلکہ قوم کا تاریخی شعور بگڑ جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کا اپنا قومی
مزاج بھی فاسد ہو جاتا ہے اور وہ اصابت رائے جو تاریخی مطالعہ سے مطلوب تھی، اسے کبھی
حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور ظاہر ہے کہ وہ قوم جو اصابت رائے سے محروم ہو جائے، اپنے حریفوں
کے مقابلہ میں شکست کھا کر آخر کار فنا ہو جاتی ہے۔

تاریخی ناول کے حق میں بعض لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ بعض ناول رزم نامہ کی حیثیت
رکھتے ہیں اور ان کے پڑھنے سے طبیعت میں ایک قسم کا جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے، مگر
ایسا جوش جو محض افسانہ سے پیدا ہو، قوم کے حق میں صحت مند نہیں ہو سکتا۔ یہ جوش کاذب
ہے اور اس کی مثال اس سرمستی کی ہے، جو میدان جنگ میں بعض اوقات مسکرات پلا کر
پیدا کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے کاذب جوش اور حقیقی شجاعت میں زمین و آسمان
کا فرق ہے۔

اردو زبان میں تاریخی ناول کی بدعت غالباً مولوی عبد الحلیم صاحب شرر نے جاری
کی تھی۔ اس وقت بھی سنجیدہ مزاج لوگوں نے ان کے افسانوں پر یہ اعتراض کیا تھا کہ اہل ملک
کے سامنے قومی تاریخ پیش کرنے کا یہ صحیح طریقہ نہیں ہے اور ابنائے قوم کے لیے تاریخی معلومات
کو ناولوں کے ذریعہ سے حاصل کرنا خطرناک ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ گذشتہ
چند سالوں میں یہ خطرہ اور بڑھ گیا ہے، کیونکہ قوم کی بے علمی اور بد مذاقی سے فائدہ اٹھا کر بعض
اشخاص نے جن کی غرض محض زر اندوزی ہے، تاریخی ناولوں کے انبار لگا دیے ہیں۔ عامۃ الناس

ان کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ یہی ہماری قومی تاریخ ہے، مگر حقیقت
یہ ہے کہ اس قسم کی ناول نویسی نہ صرف فن تاریخ کے خلاف بلکہ پوری قوم کے خلاف ایک سنگین
جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک صاحب ہیں جن کے نام کے ساتھ "مؤرخ اسلام" کے الفاظ
بالالتزام لکھے جاتے ہیں، مگر جب ان کی تالیفات پر نگاہ ڈالی جائے تو وہ تمام ناول اور
افسانے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اب "تاریخ اسلام" اور "مؤرخ اسلام" کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔

قومی فلاح اور ملی مفاد کا تقاضا ہے کہ اس بارے میں علمائے کرام اپنا فرض پہچانیں
اور جس طرح وہ دیگر دینی اور دنیوی معاملات میں قوم کی رہنمائی کرتے ہیں، اسی تاریخ اسلام
کے متعلق بھی ابنائے ملت کی رہنمائی کریں اور ان کو صحیح راستہ دکھائیں۔ علمائے کرام نے
اس بارہ میں جو غفلت برتی ہے، اسکا نتیجہ نہ صرف یہ نکلا ہے کہ یہ فن شریف نا اہل لوگوں کے قبضہ
تصرف میں چلا گیا ہے، بلکہ اس نے بعض حلقوں میں صریح طور پر افسانہ کی صورت اختیار
کر لی ہے اور اگر ان کے تغافل کی یہی حالت رہی جو اب ہے تو قوی اندیشہ ہے کہ فن تاریخ
کی صورت بالکل مسخ ہو جائے گی اور یہ علم اس سرزمین سے بالکل مٹ جائے گا۔ زمانے کا
اقتضا یہ ہے کہ وہ اس فن پر اپنی گرامی توجہ بیش از بیش مرکوز کریں اور نہ صرف درس و تدریس
کے ذریعہ مدارس کے طلبہ میں اس فن کا شوق اور صحیح ذوق پیدا کریں بلکہ تحقیق و تدقیق اور
تصنیف و تالیف سے بھی عامۃ الناس کی معلومات میں اضافہ کریں اور اپنی تالیفات کا اسلوب
بیان ایسا رکھیں جس سے ناظرین میں تاریخی معلومات کے ساتھ ساتھ تاریخی بصیرت بھی پیدا ہو،
اور تدبر و تفکر کی طرف ان کا میلان اور رجحان بڑھے۔

جو علوم و فنون آجکل ہمارے مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں، وہ سب کم و بیش افادی
حیثیت رکھتے ہیں، مگر اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ نصاب تعلیم میں تاریخ اسلام کو ایک مستقل

فن کی حیثیت سے جگہ دی جائے۔ آپ نے درس نظامی کی شہرت سنی ہوگی۔ اس کو اٹھا کر دیکھیے، اس میں
کم از کم نصف کتابیں قدیم فلسفہ اور ہیئت کی ہیں، جن کے اکثر مسائل سائنس اور فلسفہ جدید
کی ترقی کے بعد بیکار اور لاطائل ہو چکے ہیں، مگر اس میں تاریخ کی کتاب نام کو بھی نہیں۔ بعض
جدید قسم کے مدارس میں جو زمانہ حال ہی میں قائم ہوئے ہیں، سیرت کی ایک آدھ کتاب داخلِ نصاب
کر کے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر نصاب میں معیار کی وہ بلندی اور جامعیت نہیں
جو ہمیں مطلوب ہے۔

ہمارے مدارس کی یہ حالت ایک مدت دراز سے چلی آرہی ہے اور باوجود تنبیہ کے
ان میں کما ینبغی اصلاح نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر جی لائٹنر صاحب (G. Leitner) نے
گذشتہ صدی میں جب پنجاب میں مشرقی علوم کی تدریس کو سرکاری طور پر منظم کیا اور لاہور میں
پنجاب یونیورسٹی کالج کی بنا ڈالی تو انھوں نے بھی اس کمی کو شدت سے محسوس کیا تھا اور
اسے پورا کرنے کی کوشش کی تھی، اور اسی ضمن میں ایک تاریخی کتاب "سنین اسلام" کے نام سے
۱۸۷۱ء میں دو جلدوں میں شائع کی تھی۔ اس کے انگریزی دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں کہ
"مجھے چند مولوی صاحبان کا امتحان لینے کا اتفاق ہوا، جو سرکاری وظائف کے
اہل دار تھے، میں نے دیکھا کہ دیگر مقامات کی طرح پنجاب میں بھی وہ حضرات صرف و نحو
کی جزئیات کا تو اس حد تک عمیق علم رکھتے تھے جس کا مغرب کے مستشرقین کو وہم و گمان
بھی نہیں ہو سکتا، مگر جہاں تک عربی تاریخ اور ادبیات کا تعلق ہے وہ کم و بیش بالکل
کورے تھے، اس کمی کو کسی حد تک پورا کرنے کے لیے میں نے پہلے ایک خاکہ تاریخ عرب
کا تیار کیا اور پھر ایک خاکہ ادب عربی کا، کیونکہ مولوی صاحبان کو اس امر سے آگاہ کرنا
ضروری تھا کہ تاریخ عرب کا ایک معلوم اور معین تسلسل ہے اور ان کا ادب قرآن کی

تفاسیر اور صرف و نحو کی چند کتابوں تک محدود نہیں ہے، بلکہ عربی زبان میں ریاضیات،
تاریخ، طب وغیرہ علوم کے ذخیرے ہیں، اور عربوں کی تاریخ تاریخ عالم کا ایک اہم جزو ہے"
مگر افسوس کہ ڈاکٹر لائٹنر کی یہ آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی، کیونکہ وہ کتاب یعنی سنین اسلام
جو انھوں نے خاص طور پر دیسی مدارس کی ضروریات کے پیش نظر تیار کی تھی، جلد ہی لوگوں کے
ذہن سے اتر گئی اور کالج کا نصاب تعلیم جلد ہی اس سے بالکل معرا ہو گیا۔

تاریخ اسلام کو صرف نصاب میں داخل کرنا کافی نہیں ہے، بلکہ ضرورت اس امر کی ہے
کہ اس کی تدریس و تعلیم کے لیے ایسے اساتذہ مقرر کیے جائیں جن کو اس فن میں تخصص کا درجہ
حاصل ہو اور وہ اس فن کی تعلیم کا حق ادا کر سکیں۔ ان کی شخصیت میں ایسی جاذبیت اور انکے
طرز تعلیم میں ایسی خوبی اور دلکشی ہو جس سے نہ صرف طلبہ کی تاریخی معلومات بڑھیں بلکہ ان میں
فن تاریخ کا صحیح ذوق پیدا ہو، اور انھیں تاریخی مسائل پر غور و فکر کرنے کا ملکہ حاصل ہو۔ دیوبند
اور دوسرے اعلیٰ مدارس میں جہاں استاد التفسیر اور استاد الحدیث ہیں وہاں استاد التاریخ
بھی ہونے چاہئیں۔ تاکہ طلبہ تاریخی معلومات کو مستند لوگوں سے حاصل کریں۔ مگر یہ بات بہت کم
سننے میں آئی ہے کہ کسی معروف اور مستند مورخ کا تعلق ہمارے کسی تعلیمی ادارے کے ساتھ
رہا ہو۔

اساتذہ کے انتخاب میں بڑی احتیاط لازم ہے، بسا اوقات دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی
مضمون کی کرسی درا سب (Chair) قائم کرنے سے جو حقیقی مقصد تھا، وہ غلط انتخاب
سے فوت ہو گیا۔ میں اپنے مطلب کو ایک مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ آج سے تقریباً
پچیس برس پہلے علی گڑھ یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز (Islamic Studies)
کی پروفیسرشپ قائم ہوئی تھی، مگر اس پر مسٹر کرنکو (Krenkow) کا تقرر عمل میں آیا۔

جو اس لحاظ سے ناموزوں تھا کہ موصوف کا علم بیشتر جاہلی شعر و شاعری تک محدود تھا۔ وہ علی گڈھ میں سال ڈیڑھ سال تک رہے اور اس عرصہ میں اسی بات پر بحث ہوتی رہی کہ اسلامک سٹڈیز کا موضوع بحث کیا ہے اور اس کے حدود کیا ہیں۔ قیام علی گڈھ کے بعد مسٹر کرنکو نے بھری مجلس میں کہا کہ "میں جب علی گڈھ میں تھا تو ایک دوسرے شخص کے ساتھ مل کر میں نے قانون مسعودی کو ایڈٹ کرنے کی کوشش کی، مگر نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا، کیونکہ میں علم ہیئت سے ایسا ہی نابلد تھا جیسا کہ میرے ساتھی عربی زبان سے کورے تھے"۔

جب صاحب مذکور کو علی گڈھ کی آب و ہوا راس نہ آئی، اور انھوں نے اس علمی مرکز کو خیرباد کہا تو ان کے رخصت ہونے کے بعد ان کا منصب یعنی اسلامک سٹڈیز کی پروفیسر شپ بھی اس بنا پر معرض تخفیف میں آگئی کہ اسلامک سٹڈیز کو بطور ایک امتحانی مضمون کے اختیار کرنے والے طلبہ کی تعداد بہت قلیل تھی۔ اور فاضل موصوف کے درس میں حاضرباش طلبہ کی تعداد بہت کم ہوا کرتی تھی، اور یہ امر ہمارے لیے قطعاً باعث تعجب نہیں کیونکہ موصوف کی علمی دلچسپی کا مرکز جاہلی شعرا تھے اور وہ اسلامیات جیسے وسیع مضمون کی تدریس کا حق ادا کرنے سے قاصر تھے جس میں علوم دینیہ شرعیہ کا عنصر غالب ہونا چاہیے۔ ان کی ناکامی خصوصاً ایسے حالات میں باعث حیرت نہیں، جبکہ اس جدید مضمون کے حدود بھی ابھی تک ان کے اپنے ذہن میں اور ارباب یونیورسٹی کے ذہن میں واضح طور پر معین نہیں ہوئے تھے۔

دوسرے علمی مرکزوں میں بھی بعض "کرسیوں" اور ان کے متعلقہ علوم کا ایسا ہی افسوسناک انجام ہوا ہے، مگر اس کی تفصیل کے لیے یہاں گنجائش نہیں، ان امور میں قومی انحطاط کے اسباب پر غور کرنے والوں کے لیے بڑا سرمایۂ عبرت موجود ہے۔

خلاصۂ کلام | قومی شعور کی بیداری اور پائیداری اور احساس ملی کی استواری کے لیے

قومی تاریخ کا علم نہایت ضروری ہے۔ تاریخ اسلام کی ملی اور قومی اہمیت کے پیش نظر یہ بات دانشمندی سے بہت دور ہے کہ اس فن کو نااہل لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے، علماء کرام کا فرض ہے کہ وہ قومی تاریخ کے بارے میں ابناء ملت کی صحیح رہنمائی کریں، تاریخ اسلام کو ہمارے مدارس اور دارالعلوموں کے تقریباً ہر درجہ کے نصاب میں داخل ہونا چاہیے تاکہ ابنائے قوم میں ابتدا ہی سے تاریخ کا صحیح ذوق پیدا ہو اور تاریخی معلومات کے ساتھ ساتھ انھیں تاریخی بصیرت بھی حاصل ہو۔ نیز اس مضمون کی تدریس کے لیے ایسے اساتذہ کا تقرر ہونا چاہیے جن کو اس فن کے ساتھ طبعی مناسبت ہو اور وہ نہ صرف تدریس و تعلیم سے اس فن کو زندہ رکھیں، بلکہ ہمارے شاندار ماضی کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے پیش کریں اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ سے ہمارے تاریخی ادب کو بھی مالامال کر دیں جس سے موجودہ نسل مستفید ہو اور وہ آیندہ نسلوں کے لیے بھی سرمایۂ خیر ثابت ہو۔

اقبال سہیل میری نظر میں

از

جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل

بیا در دیدہ گرایں جا بود سخن دانے غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

اقبال سہیل میرے ہموطن اور عزیز خاص تھے، اس لیے فطری طور پر مجھکو ان کی دائمی مفارقت کا رنج و افسوس ہے، لیکن آج مجھکو ایک خاص ملال ہے، اور یہ ملال مجھکو اکثر ان کی زندگی میں بھی رہا ہے، قدرت نے ان کو ایک غیر معمولی دماغ عطا کیا تھا جس سے اگر وہ صحیح طور پر کام لیتے، تو یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ علامہ شبلی کا صحیح معنوں میں کوئی جانشین نہیں ہے، لیکن ان کے مزاج کی وارفتگی کو کیا کہا جائے کہ ایک مدت تک وہ اس کا فیصلہ نہ کر سکے کہ انھوں نے علامہ شبلی اور مولانا حمید الدین کی علم پرور صحبتوں سے جو متاع گراں اور حاصل کی ہے، اس کو کس طرح صرف کیا جائے، لیکن جب طبیعت میں کچھ استقلال پیدا ہوا، اور فیصلہ کا وقت آیا تو انھوں نے جو فیصلہ کیا وہ علمی و ادبی دنیا کے لیے ایک عبرت ناک حادثہ ہے، مجھکو یقین ہے کہ وہ جب احاطۂ عدالت میں جہاں جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنا بہت بڑا کمال سمجھا جاتا ہے، قدم رکھنے کا ارادہ کر رہے تھے، تو کارکنان قضا و قدر نے ضرور صدا دی ہو گی کہ "تیری شان ان مشاغل سے بالاتر ہے" لیکن افسوس ہے کہ ان پر کچھ ایسی غفلت طاری رہی کہ ان کا ضمیر اس صدائے غیبی سے متاثر نہ ہو سکا، اور وکالت کا عذاب نازل ہو کر رہا جس کی بدولت ان کی حیرت انگیز استعداد و قابلیت کی حقیقی

شان دنیا کے سامنے جلوہ گر نہ ہو سکی اور علم و فن کو اپنی بدنصیبی کا ماتم کرنا پڑا، حالانکہ خدا نے ان کے دماغ کو جو گوناگوں صلاحیتیں عطا کی تھیں، ناممکن تھا کہ کوئی علمی و ادبی ادارہ ان کے خیر مقدم کے لیے تیار نہ ہوتا۔

مرحوم عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی کے بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے لیکن ناظرین کو شاید معلوم نہ ہو کہ انگریزی کی طرف ان کی مستقل توجہ اس وقت ہوئی تھی، جب وہ عربی و فارسی کی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے، یہ کوئی آسان کام نہ تھا، لیکن اپنی غیر معمولی فطری ذہانت کی بدولت ان کو کسی راہ میں ناکامی کا سامنا کرنا نہیں پڑا، جس میدان میں قدم رکھا جس محفل میں پہنچے پرچم اقبال ہمیشہ ان کے سر پر لہراتا رہا، غرض ان کی بلند نظری اور عالی دماغی نے ان پر حریف مقابل کا رعب کبھی طاری ہونے نہیں دیا، ان کا انداز ہمیشہ فاتحانہ ہی رہا، ان کے مخاطب کو محسوس کرنا پڑتا تھا کہ ان کو خاموش کرنے کے لیے معمولی اور سطحی دلائل کچھ کام نہیں دے سکتے۔

مرحوم مجھ سے عمر میں بارہ تیرہ سال بڑے تھے لیکن جہاں تک انگریزی تعلیم کا تعلق تھا، وہ میرے ہم سبق تھے، ۱۹۱۴ء میں ایف، اے پاس کرنے کے بعد وہ علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے، جہاں چار سال تک میرا ان کا ساتھ رہا، یہاں ان کی حیثیت ایک گوشہ نشین طالب علم کی نہیں تھی، بلکہ ہر موقع پر ان کی فطری ذہانت کے جلوے لوگوں کو نظر آتے رہے، غرض جب تک علی گڑھ میں قیام تھا، کالج کا ہر شعبۂ حیات ان کی شخصیت سے نمایاں طور پر متاثر ہوتا رہا، سیاسی، علمی، ادبی کوئی مجلس ایسی نہیں تھی، جہاں اس جوہر قابل کی تابانیوں سے نگاہیں خیرہ نہ ہوئی ہوں۔

۱۹۱۸ء میں مرحوم قانون پاس کر کے وطن واپس آئے اور نہایت مستعدی کے ساتھ وکالت شروع کی جس کا سلسلہ وفات سے تقریباً دو سال قبل تک برابر قائم رہا، ذہانت اور قوت تقریر کی بدولت ان کو اپنی کامیابی کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا، چنانچہ بہت جلد ان پر زر و سیم کا

کی بارش ہونے لگی، لیکن اس حال میں بھی ان کی بلند نظری اور عالی حوصلگی قائم رہی، یعنی ان کا دل حبِ [مال] کی معصیت سے ہمیشہ پاک رہا، چنانچہ جب بیمار ہو کر وکالت کے کام سے معذور ہوئے تو ان کی حیثیت ایک مفلس قانع کی تھی، مجھکو ان کی اس تہی دستی اور بے نوائی کا غم نہیں، کیونکہ مال و زر جمع کرنے والوں کو قرآن مجید نے جس عذاب الیم کی بشارت دی ہے، اس سے وہ یقیناً محفوظ ہوں گے، البتہ چمنستان شعر و ادب کے اس بلبل رنگیں نوا کو عدالتوں میں دیہاتی جہلا کے ساتھ جرح میں الجھتے ہوئے دیکھتا تھا تو مجھے گردشِ روزگار کا عجیب عبرتناک منظر نظر آتا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ خدا کی طرف سے کوئی ناانصافی نہیں ہوتی، بلکہ انسان خود اپنی صلاحیتوں پر ظلم کرتا ہے، ممکن ہے کہ مرحوم اپنی وکالت کی کامیابی سے خوش رہے ہوں، لیکن ایک ایسا دماغ جس کی نکتہ سنجیوں سے علم و فن کے بہت کچھ حقایق بے نقاب ہو سکتے تھے، اس کے لیے عدالتی مقدمات کی ترتیب کوئی ایسا کمال نہیں تھا، جس پر فخر کیا جا سکے، ان کا اصلی سرمایۂ فخر و ناز ان کی وہ گوناگوں دماغی خصوصیات تھیں، جن کی کوئی مستقل یادگار دنیا کو نصیب نہ ہو سکی، پھر بھی باوجود اپنی فطری تساہلی اور بے اصولی کے وہ کچھ اپنے نتائجِ افکار چھوڑ گئے ہیں، جو اپنے اندر ارباب فن کے لیے علمی اور ادبی حیثیت سے ذوق و لذت کا بہت کچھ سامان رکھتے ہیں، اور جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر انھوں نے غلط روی اختیار نہ کی ہوتی، تو وہ علم و ادب کے افق پر سہیل نہیں بلکہ آفتاب بن کر چمکتے۔

اگرچہ مرحوم نے کوئی مستقل علمی تصنیف نہیں کی، لیکن وہ تمام قابلیتیں جو ایک کامل الفن مصنف کے لیے ضروری ہیں، ان میں موجود تھیں، وہ فطرۃً فلسفی تھے، ان کا دماغ خالص فلسفیانہ تھا، فلسفہ غالباً پڑھا بھی تھا، جس کا اندازہ ان کے طرزِ استدلال سے کافی طور پر ہوتا تھا، وہ کسی علمی مسئلہ پر اپنے نقطۂ خیال کی تائید میں جو دلائل پیش کرتے تھے وہ سطحی اور عامیانہ نہیں ہوتے تھے، بلکہ ان میں ایک خاص قوت اور گہرائی ہوتی تھی، طبیعت میں جدت و اجتہاد کا مادہ بھی تھا، شاہراہ عام سے

الگ ہو کر ہمیشہ دقیق نکتے پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے، نظر بھی تنقیدی اور محققانہ پائی تھی، جو اصل حقیقت تک بہت جلد پہنچ جاتی تھی، زود فہمی اور انتقالِ ذہنی کا یہ عالم تھا کہ اِدھر اُدھر سے کچھ ورق گردانی کر کے کتاب کے اصل موضوع پر کامل عبور حاصل کر لیا کرتے تھے، نکتہ چینی میں معیار کی بلندی ہمیشہ پیش نظر رہتی تھی، خیالات کا دامن ابتذال و پستی سے کبھی آلودہ ہونے نہیں پاتا تھا، ذہانت کے علاوہ مرحوم کا حافظہ بھی عجیب و غریب تھا جس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے، تعلیم کا زمانہ ختم کرنے کے بعد غالباً مطالعۂ کتب کی زحمت کبھی گوارا نہیں کی، لیکن جو کچھ پڑھا تھا، وہ سب آخر وقت تک دماغ میں محفوظ تھا، چنانچہ کسی مسئلہ پر بحث و استدلال کے لیے ان کو کتاب کھولنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی، صرف اپنی قوتِ حافظہ سے کام لے کر سامع کو حیرت میں ڈال دیتے تھے، ہر موضوع پر خواہ اس کا تعلق مذہب و سیاست سے ہو، یا علم و ادب سے، ان کی ہمہ گیر طبیعت یکساں حاوی تھی، عام معلومات کا ذخیرہ بھی کم نہ تھا، ان گوناگوں اوصاف کے ساتھ ایک سحر طراز اور پرزور قلم بھی ہاتھ میں تھا، جس کی ادیبانہ طرزِ نگارش دیکھ کر شعر العجم کے مصنف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، غرض کسی چیز کی کمی نہیں تھی، کاش طبیعت میں کسی قدر استقلال ہوتا، تو وہ ایک نکتہ سنج اور دقیق النظر مصنف کی حیثیت نہایت آسانی کے ساتھ حاصل کر سکتے تھے،

مرحوم نے اگرچہ نثر نگاری کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی، طبیعت کا رجحان زیادہ تر شاعری ہی کی طرف رہا، تاہم ان کے انشا پردازانہ کمال سے کسی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا، کبھی قلم اٹھاتے تھے تو ان کی رعنائی اور برجستگی پر حیرت ہوتی تھی، ہر فقرے سے ایک بلند پایہ اور کہنہ مشق ادیب کی شان نظر آتی تھی، اس موقع پر مرحوم کا وہ فاضلانہ تبصرہ یاد آگیا جو انھوں نے اصغر کے مجموعۂ کلام نشاطِ روح پر لکھا تھا، جس کو میں نے ۱۹۲۵ء میں شائع کیا تھا، یہ تبصرہ کتاب کے ۸۰ مطبوعہ صفحات پر مشتمل ہے، جس کو پڑھنے کے بعد مرحوم کی دقتِ نظر اور ادیبانہ قابلیت کے لیے کسی مزید ثبوت کی

ضرورت محسوس نہیں ہوتی، شاعری کی حقیقت اکثر زیر بحث رہی ہے، اس کے ارکان و عناصر پر اساتذۂ فن نے مختلف انداز سے اظہار خیال کیا ہے، لیکن اس پامال موضوع پر بھی تبصرہ کے ابتدائی صفحات میں مرحوم نے اپنا جو زاویۂ نگاہ پیش کیا ہے، اس کی شان کچھ مجتہدانہ نظر آتی ہے، شاعر کے لطیف اور نازک محاسنِ کلام پر جس بلیغ اور محققانہ انداز بیان کے ساتھ تنقید کی ہے، اس سے ان کی غیر معمولی قوتِ نقد کا بھی کافی اندازہ ہوتا ہے۔

ادبی دنیا میں وہ عام طور پر ایک قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی شاعری سے کہیں زیادہ حیرت انگیز ان کی سخن سنجی کی صلاحیت تھی۔ ان کی ناقدانہ نظر جس تیزی کے ساتھ دقیق سے دقیق شعر کے اصل مفہوم اور اس کے محاسن و معائب کی تہ تک پہنچتی تھی، اس کی مثال ان کے ہمعصر اہل فن میں مشکل سے مل سکتی ہے۔ میں ذاتی واقفیت کی بنا پر بلاخوف تردید یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ وہ اس حیثیت سے یگانۂ روزگار تھے، غالب کے دقیق فلسفیانہ اشعار کی تشریح میں نے اکثر ان کی زبان سے سنی ہے، ان لطیف نکتوں تک جن پر وہ روشنی ڈالتے تھے، دیگر شارحین کی نگاہ غالباً مشکل سے پہنچ سکتی ہے۔

دماغ کی فلسفیانہ ساخت نے مرحوم کی فکر و نظر کو نہایت دقت پسند بنا دیا تھا، مذاق عام کی راہوں سے ہمیشہ بچ کر ان کا قدم اٹھتا تھا، شعر میں جب تک عام فہم سے ماورا کوئی لطیف بات نہ کہی گئی ہو، ان سے خراج تحسین وصول کرنا نہایت مشکل بلکہ ناممکن تھا، ان کی نگاہیں جو ہمیشہ اسرار حقیقت کے مخفی جلوؤں کی متلاشی رہتی تھیں، محض تماشائے لب بام سے کیف اندوز نہیں ہو سکتی تھیں، ان کا قول تھا کہ وہ شعر شعر نہیں جس کا مفہوم کچھ دماغی غور و فکر کا طالب نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ اردو شعرا میں وہ سب سے زیادہ غالب کے مداح اور گرویدہ تھے، اور یہ ان کے ذوقِ بلند کی بہت بڑی دلیل تھی، ان کا جدت آمیز مذاق ہمیشہ یہی صدا دیتا رہا "نمی رویم براہے کہ کاروان رفت است" انکی چشم بصیرت میں ہمیشہ اسی دعا کا سرور تھا

"ہر جلوۂ مرا نتواند فریب داد
پروانۂ چراغ سر طور بودہ ایم"

ناظرین شاید جاننا چاہیں گے کہ وہ "چراغ سر طور" کہاں تھا جس سے سہیل نے اکتساب نور کر کے بزم سخن کو ایک نئے انداز سے جگمگا دیا، اس کا جواب خود ان ہی کی زبان سے سننا چاہیے، چنانچہ ایک فارسی قصیدہ کے ابتدائی اشعار میں بظاہر کچھ اپنی مدح سرائی کر کے اصل مرکز فیض کی طرف یوں رجوع کرتے ہیں:

گمان خویش ستائی مبر کہ بود — مدیح من ہمہ راجع بہ ذات عمانی
گرت شگرفی نقشے در آورد بہ شگفت — رسد بہ خامۂ نقاش آفریں خوانی
رہین جرعۂ فیضان شبلی است کہ من — بہ قطرۂ بنویسم برات عمانی
ز فیض تربیتش ایں سہا سہیل شدہ است — وگرنہ ناسرہ نقدم بہ ہیچ نستانی

ان اشعار نے اب قلم کی رو مرحوم کی شاعرانہ حیثیت کی طرف پھیر دی ہے، جس کا حق ادا کرنے کے لیے ایک مبسوط تبصرہ درکار ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس مختصر مضمون میں کسی تفصیل کی گنجائش نہیں، تاہم کچھ اظہار خیال کیے ہوئے بغیر قلم آگے بڑھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

سہیل کے ہمہ گیر دماغ کو غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی وغیرہ تمام اصناف سخن پر یکساں قدرت حاصل تھی، جب اور جو کچھ لکھنا چاہتے تھے، ان کے قلم کی روانی اور برجستگی میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ غیر معمولی قوتِ نظم کے علاوہ عربی اور فارسی تعلیم کی بدولت ان کے دماغ میں ہر قسم کے فصیح و بلیغ الفاظ اور لطیف و نازک ترکیبوں کا ایک وسیع ذخیرہ موجود تھا، اس لیے شاعری کے کسی میدان میں ان کے طائر خیال کو عجز و درماندگی کا احساس نہیں ہو سکتا تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے شاعرانہ کمالات کا اصلی تماشاگاہ بجز قصیدہ ہی کا میدان تھا، جہاں کسی اور کو ان کے سامنے حریف مقابل بن کر کھڑے ہونے کی مشکل سے جرأت ہو سکتی تھی، یہ محض عزیزانہ محبت کا جوش نہیں ہے، بلکہ ایک روشن حقیقت ہے، جس سے کوئی صاحب نظر قصائد میں ان کی قوتِ تخئیل کی سحر کاریوں اور انداز بیان کی رعنائیوں کا ہوش ربا منظر دیکھ کر انکار

نہیں کر سکتا، ایران کا مغرور عرفی زندہ ہوتا تو ہم اپنے اس خاکسار ہندی نژاد عرفی کو اس کے سامنے نہایت فخر کے ساتھ پیش کر سکتے تھے، پھر اس کو غالباً تسلیم کرنا پڑتا کہ اس نے اپنے اس شعر میں

اقبال سکندر بہ جہانگیری نظم
برداشت بہ یک دست علم را و قلم را

جس فخر کا اظہار کیا ہے، وہ اس کا تنہا مستحق نہیں تھا،

غزل گو شعرا کی طرح سہیل کی شاعری کسی ایک خاص موضوع تک محدود نہ تھی، وہ فطرۃً شاعر پیدا ہوئے تھے، اس لیے جب کوئی موثر واقعہ یا منظر پیش آتا تھا، تو بے اختیار ان کے سحر طراز قلم میں جنبش پیدا ہو جاتی تھی، اور پھر وہ جنبش ایک موج گہر بار بن کر نگاہوں کو خیرہ کر دیتی تھی، یوں تو ان کی ہر قومی، ملی، اور سیاسی نظم جس سے ان کے شاعرانہ احساس کی تپش اور وسعت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، ایک کامل الفن شاعر کا نتیجۂ فکر ہے، ممکن ہو کہ قومی یا سیاسی شاعری کے میدان میں سہیل کا کوئی حریف نکل آئے، لیکن نعت کی بزم تجلی میں افراط و تفریط سے محفوظ رہ کر جس احتیاط اور محبت و احترام کے ساتھ انھوں نے اپنے اخلاص و عقیدت کی نذر پیش کی ہے، اس کی مثال سے اردو شاعری اب تک خالی ہے، اس کی تصدیق کچھ ان کے کلام ہی سے ہو سکتی ہے، چنانچہ ایک نعتیہ قصیدہ کے چند اشعار ہم نقل کرتے ہیں، جن سے اندازہ ہوگا کہ وہ ذات اقدسؐ کن کمالات کی جامع تھی، جس کی روحانی جلالت و عظمت کے سامنے کفر و باطل کے قصر ہائے فلک بوس پست ہو کر رہ گئے تھے، ملاحظہ ہو:

محمدؐ وہ کتاب کون کا طغرائے پیشانی
محمدؐ وہ حریم قدس کا شمع شبستانی

محمدؐ یعنی وہ حرف نخستیں کلک فطرت کا
محمدؐ یعنی وہ امضائے توقیعات ربانی

وہ فاتحؐ جس کا پرچم اطلس زنگاری گردوں
وہ امیؐ جسکے آگے عقل کل طفل دبستانی

وہ رابطؐ عقل و مذہب کو گیا شیر و شکر جس نے
وہ فارقؐ زہد سے جس نے مٹایا داغ رہبانی

وہ ناطقؐ جسکے آگے مہر بلب بلبل سدرہ
وہ صادقؐ جسکی خنگوئی کا شاہد نطق ربانی

وہ عادلؐ جسکی میزان عدالت میں برابر ہے
غبار مسکنت ہو یا وقار تاج سلطانی

وہ جامعؐ جس نے یکجا کر دیے بکھرے ہوئے دانے
مشادی جس نے آکر باہمی تفریق انسانی

وہ گنجور معارفؐ جسکے اک اک حرف میں پنہاں
نکات فلسفی، اسرار نفسی، راز عمرانی

وہ کشاف سرائرؐ جس نے کھولا چند اشاروں میں
علوم اولین و آخریں کا گنج پنہانی

یہ نہایت سیر حاصل قصیدہ ہے، جس کا پورا لطف شروع سے آخر تک پڑھنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، افسوس ہے کہ طوالت کے خوف سے محض چند اشعار پر اکتفا کرنا پڑتا ہے، لیکن اسی قصیدہ میں اصل نعت کے بعد سہیل کے خامۂ رنگیں نگار نے معراج کے پُر اسرار منظر کی جو تصویر پیش کی ہے، دل گوارا نہیں کرتا کہ ناظرین کو اس سے بالکل محروم کر کے آگے بڑھ جاؤں پہلے ہی شعر میں روحانی و جسمانی بحث کا خاتمہ کر دیا ہے.

وہ جسم پاک خود سرتا قدم پیکر تھا نورانی
تو پھر معراج میں کیا بحث روحانی و جسمانی

آگے چل کر اس مشکل کو اور زیادہ آسان کر دیتے ہیں

براق برق پیکر لے چلا یوں ذات انورؐ کو
فضا میں تیر جائے جس طرح بجلی کی تابانی

حضورؐ اس طرح گذرے گنبد مینائے گردوں سے
نظر جس طرح شیشے سے گذر جائے بہ آسانی

یہ لطیف و نازک تشبیہ کتنی مسکت دلیل ہے کہ اس کے بعد دل کو عقل مو شگاف کی کاوش بے جا سے نجات مل جاتی ہے، اور یقین و ایمان کے غبار آلود نقوش چمک اٹھتے ہیں.

عام نعت گویوں نے اتنا ضرور بتایا کہ براق و جبرئیل سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ کر رک گئے، اس سے آگے قدم رکھنے کی مجال نہ تھی، لیکن یہ نہ بتا سکے کہ پھر اس کے بعد بارگاہ قدس تک پہنچانے کا نازک فرض کس کے سپرد ہوا، اس کا اور اک صرف سہیل ہی ایسے عالی نظر شاعر کی قوت تخیل کر سکتی تھی، ملاحظہ ہو:

براق و جبرئیل آخر رکے سدرہ کی منزل پہ
کہ تھی یہ انتہائے سرحد اقلیم امکانی

یہاں سے لے چلیں پھر آپؐ کو موجیں تجلی کی
وہ رفرف ہو کہ انوار ازل کا جوش فیضانی

سواد لامکاں تک رک گیا رفرف کہ اسکو بھی   کہاں اس خلوتِ وحدت میں اذن گرم جولانی

کسی نے لے لیا خود بڑھ کے آغوش محبت میں   ہوا ملک قدم خلوت سرائے حسن امکانی

علاوہ جوش عقیدت کے جس سے سہیل کی تمام نعتیہ نظمیں لبریز ہیں، ناظرین ان کی صحیح المذاقی، قادر الکلامی اور علمی تبحر کا کچھ اور سماں دیکھنا چاہیں تو ان کی وہ آخری نظم ملاحظہ کریں جس کا نام ان کی بلاغت شناس طبیعت نے "موج کوثر" رکھا تھا، یہ کوئی نمایشی نام نہ تھا، پوری نظم پڑھنے کے بعد مذاق سلیم کو اس اعتراف میں تامل نہیں ہو سکتا کہ وہ در اصل حقائق و معانی کا ایک سرچشمہ تھا، جو وجد و حال کے کسی عالم خاص میں شاعر کے قلب و روح کی گہرائیوں سے نکل کر نا محدود تابانیوں کے ساتھ شگاف قلم سے ابل پڑا تھا،

شروع سے آخر تک اس نظم کے جمالِ معنوی اور شوکتِ الفاظ کا جو عالم ہے، اس کا اندازہ ناظرین ذیل کے چند اشعار سے کر سکتے ہیں:

احمد مرسل فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم   مظہر اول مرسل خاتم صلی اللہ علیہ وسلم

جسم مزکی، روح مصور، قلب مجلی، نور مقطر   حسن سراپا خیر مجسم صلی اللہ علیہ وسلم

طینت جس کی سب سے مطہر، بعثت جسکی سب سے موخر   خلقت جسکی سب پہ مقدم صلی اللہ علیہ وسلم

فرد و جماعت، امر و اطاعت، کسب و قناعت، عفو و شجاعت   حل کیے جو اسرار تھے مبہم صلی اللہ علیہ وسلم

ربط و تصادم، طوع و تحکم، فقر و تنعم، عدل و ترحم   سب کے حدود دبتائے باہم صلی اللہ علیہ وسلم

دنیا میں جس نے سلطانی کی جگت میں جس نے جہانبانی کی   زہد و سیاست کر دیئے توام صلی اللہ علیہ وسلم

وہ مصداق دنی فتدلی، جسکی منزل عرش معلی   نکتۂ "ما اوحی" کا محرم صلی اللہ علیہ وسلم

جتنے فضائل جتنے محاسن ممکن میں ہو سکتے تھے ممکن   حق نے کیے سب اس میں فراہم صلی اللہ علیہ وسلم

علم لدنی، شان کریمی، خلق خلیلی، نطق کریمی   زہد مسیحا، عفتِ مریم صلی اللہ علیہ وسلم

بندۂ خدا سے واصل، خاکی اور انوار کا حامل   امی اور اسرار کا محرم صلی اللہ علیہ وسلم

حد امم سلطان مدینہ وہ جسکے کفِ پا کا پسینہ   گل کدۂ فردوس کی شبنم صلی اللہ علیہ وسلم

اتنی مشکل ردیف اور بحر میں ایک طویل نظم لکھنا، اور کہیں سے الفاظ کی نشست، فقروں کے دروبست اور بندش کی چستی میں فرق نہ آنا، کیا شاعرانہ کمال کی دلیل نہیں ہے؟

اسی سلسلہ میں ناظرین سہیل کے اس مخمس قصیدہ کے بھی چند بصیرت افروز اشعار سن لیں جو انھوں نے ولادت نبوی پر لکھا تھا،

بہارستان ہستی کے لیے دور شباب آیا   رگ فطرت میں ریعان نمو کا اضطراب آیا

نظام آفرینش کو پیام انقلاب آیا   فضائے کن فکان میں پرچم ختمی مآب آیا

شہنشاہِ دو عالم، مہبط ام الکتاب آیا

وہ موجِ بے قرار اٹھی ہی عمان تجلی سے   زمانہ جگمگا اٹھا ہی فیضان تجلی سے

شبستانِ جہاں روشن ہوئی شان تجلی سے   ہوئی ظلمت گریزاں جوش طوفان تجلی سے

رسالت کے افق پر نور حق کا آفتاب آیا

شعاعِ سرمدی جسکی جبین پاک پر رقصاں   جمال ایزدی جسکے فروغ حسن سے رخشاں

فضائے قدس کا ہر جلوہ جس کے نور پر قرباں   بسیط خاک کا ہر ذرہ جس کا تابعِ فرماں

وہ سلطان الامم آیا وہ مختار الرقاب آیا

وہ آئینہ دکھایا جس نے عکس روئے جاناں کو   نمایاں کر دیا جس نے فروغ حسن پنہاں کو

عطا کی دولت نظارہ جس نے دیدۂ جاں کو   چراغاں کر دیا جس نے تجلی گاہ امکاں کو

وہ جلوہ اب جمالِ احمدی میں بے نقاب آیا

معارف کا خیاباں تازہ جسکی رشحہ باری سے   مکارم کا چمن شاداب جسکی آبیاری سے

شناسا جس نے عالم کو کیا توحید باری سے   دلوں کی کھیتیاں سرسبز جسکے فیض جاری سے

وہ دریائے کرم آیا وہ رحمت کا سحاب آیا

اس مبارک موضوع پر اور بھی نظمیں ناظرین کی نظر سے گذری ہوں گی لیکن یہ پرشکوہ، بلیغ اور پرکیف انداز بیان اور کہیں غالباً نظر نہ آیا ہوگا، میرا خیال نہیں بلکہ یقین ہے کہ ان روح پرور نغموں پر عالم قدس کی فضا بھی جھوم اٹھی ہوگی،

مذکورۂ بالا اشعار سے ارباب بصیرت نے سہیلؔ کی نعتیہ شاعری کی ایک خاص خصوصیت کا اندازہ کیا ہوگا یعنی باوجود انتہائی جوش عقیدت کے یہ نازک حقیقت ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتی ہے کہ جس کی مدح سرائی میں ان کا قلم اٹھا ہے، وہ خدا نہیں ہے، خدا کا بندہ ہے جس کو نبوت کا اعلیٰ ترین درجہ عطا کیا گیا ہے، افسوس ہے کہ نعت گو شعرا کو عام طور پر اس نزاکت کا احساس نہیں ہوتا، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ عبدیت و نبوت کی شان کے منافی قلم سے ایک لفظ بھی نکل جانا ناقابلِ عفو معصیت ہے،

نعت دراصل نہایت نازک مرحلہ ہے، جہاں ہوش و بصیرت سے کام نہ لیا جائے تو ہر قدم پر لغزش کا امکان ہے، اس لیے ہر راہ رو اس مقدس راہ سے کامیاب نہیں گذر سکتا، یہ کوئی دنیا کا عرصۂ راز نہیں ہے کہ قدم پس و پیش کو نظر انداز کرکے بلا کسی غور و احتیاط کے گرد و غبار اڑاتا بڑھتا چلا جائے، بلکہ جیسا کہ کسی صاحب نظر شاعر نے کہا ہے:

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر　نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

یہ مقام ہی کچھ ایسے جلال و عظمت کا حامل ہے کہ بڑے بڑے رہروان تیز گام سرنگوں چلنے پر مجبور ہوتے ہیں، مغرور عرفی جو اپنے زور طبع اور جولانی قلم کے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، اس کو بھی دفعۃً چونک کر کہنا پڑتا ہے

عرفی متاب ایں رہ نعت است نہ صحرا است　آہستہ کہ رہ بر دم تیغ است قدم را

سہیلؔ بھی باوجود کمال سخنوری کے عجز و درماندگی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں

خرد عاجز، نظر خیرہ، زباں کج مج، بیاں قاصر　زمین نعت میں کیا وہ بجھے داد سخندانی

محض انکسار نہیں ہے بلکہ ایک ناقابل انکار حقیقت کا اعتراف کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ وہ ذات گرامی جس پر خدا اور اس کے ملائکہ درود و سلام بھیجتے تھے، جو سراپا جمال سرمدی کی نامحدود تابانیوں کی نظارہ گاہ تھی، جس کے ظہور کا جلوۂ جاں نواز کفر و باطل کی تمام تاریکیوں کے لیے پیام شکست تھا، اس کی مدح و ثنا کا حق عاجز و بے نوا انسان کی زبان کیا ادا کر سکتی ہے؟

لیکن پھر بھی ہم دبی زبان سے اتنا کہنے کی جرأت کریں گے کہ سہیلؔ کے خامۂ رنگیں نگار سے جو کچھ نکل گیا ہے، اس سے زیادہ ایک انسان کی زبان اور کچھ نہیں کہہ سکتی، معلوم نہیں سپرد خاک ہونے کے بعد ان کے اعمال کی پرسش کیا ہوئی ہوگی، لیکن اس کا یقین ہے کہ آستانۂ رسالت پر انھوں نے اخلاص و عقیدت کی جو نذر بے بہا پیش کی تھی وہ رائگاں نہ گئی ہوگی، نسیم مغفرت کے جھونکوں نے ان کی خوابگاہ ابدی کو ضرور سر سبز و شاداب کیا ہوگا، میرا یقین کیا، سہیلؔ نے بجا طور پر اس توقع کا اظہار خود اس شعر میں کر دیا تھا،

خود سیہ نامہ سہی لیکن انہی کا ہے غلام　پھر سہیلِ زار کیوں ہو مغفرت سے ناامید

ارباب ظاہر کو شاید حیرت ہو کہ ایک شخص جو اپنے کو سیاہ کار کہہ رہا ہے، اس کو مغفرت کی امید کیونکر ہو سکتی ہے؟ لیکن اگر اس چیز پر نظر رکھیں، جس کی تقویت پر وہ مغفرت کا امیدوار ہے تو ان کی ساری حیرت جاتی رہے گی، اور ان کو اس کے تسلیم کرنے میں تامل نہ ہوگا کہ تنہا قیام و سجود ہی نجات کا وسیلہ نہیں ہے، بلکہ اور بھی اعمال ہیں، جن کی بدولت مرنے والے کی روح کو سحابِ رحمت کی تر دستیاں نصیب ہو سکتی ہیں، خواجہ حافظ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا۔

نصیبِ ماست بہشت اے خدا شناس برو　کہ مستحقِ کرامت گناہ گارانند

کیا ناظرین کا یہ خیال ہے کہ سہیلؔ نے چند نعتیہ قصائد لکھ کر محض شاعری کا ایک رسمی فرض ادا کر دیا تھا، وہ گل و بلبل کی شاعری نہ تھی، بلکہ دراصل ان کے قلب و روح کے کچھ پرکیف سجدے تھے،

جو بے اختیار جبین قلم سے صفحۂ کاغذ پر ٹپک پڑے تھے، اعمال ظاہری پر فخر کرنے والوں کے نزدیک ممکن ہے کہ ان منظوم سجدوں کی کوئی قیمت نہ ہو، لیکن ہم کو یقین ہے کہ جس وقت ہم اس پیکر کمال کو سپرد خاک کرنے کے لیے لے جا رہے تھے، فرشتگانِ رحمت نے یہ صدا ضرور دی ہوگی،

قدم دریغ مدار از جنازۂ اقبالؔ
کہ گرچہ غرق گناہ است می رود بہ بہشت

قلم کی روانی اس دلچسپ موضوع کو کچھ اور پھیلانا چاہتی تھی کہ دفعۃً سہیلؔ کی وہ نظمیں بھی یاد آگئیں جو انھوں نے بارگاہ رسالتؐ کے محرمان خاصؓ کی مدح و ستایش میں لکھ کر سعادت دارین حاصل کی تھی، اور اپنے حق مغفرت کو کچھ اور مستحکم کر دیا تھا، منقبت بھی ایک خاص مقام ہے، جہاں شاعر کے لیے قدم اٹھانے کی سب سے پہلی شرط فرق مراتب کا احساس ہے، یعنی بارگاہ نبوت سے جو درجہ جس نفس پاک کو عطا ہوا ہے، اس کا لحاظ رکھتے ہوئے مدح و ستایش کا قلم اٹھایا جائے ورنہ داغ معصیت سے کلام کے داغدار ہونے کا خطرہ ہے، کسی صاحب بصیرت کا مشہور قول ہے "گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی"

سہیلؔ اگرچہ یہاں بھی جوش عقیدت سے بے تاب ہیں لیکن فرق مراتب کے احساس سے ان کا دل ناآشنا نہیں ہے، یہ ان کی منقبت نگاری کی خاص معنوی خوبی ہے، رہا انداز بیان تو ان کے ابر قلم کی گہرافشانیوں نے اس زمین کو بھی لالہ زار طور بنا دیا ہے، جس کی رنگینیاں دیکھ کر حریم قلب کا ہر گوشہ نور ایمان سے جگمگا اٹھتا ہے، ایک نظم کے کچھ گہر ہائے آبدار ناظرین ملاحظہ کریں، حضور سرور کائنات کی بارگاہ قدس میں حاضری دیکر صحابہ کرامؓ کی طرف یوں رجوع کرتے ہیں:

گلزار دین پاک کا پھر وہ آبیار
جانِ بہار، جانِ چمن، جانِ کائنات

وہ صادق و مصدق و صدیق مصطفےٰ
بوبکرؓ وہ گزیدۂ اعیانِ کائنات

ارکانِ شرع جس کی خلافت سے استوار
مرصوص جس کے فیض سے بنیانِ کائنات

وہ جس کا سینہ مہر رسالت کا آئینہ
وہ جس کا چہرہ شمع فروزانِ کائنات

کافر نہیں کہ اس کی امامت میں شک کریں
خود جس کے مقتدی ہوئے سلطانِ کائنات

پھر ان کے بعد مالک خلافت کا تاجدار
وہ بوریا نشین شہ شاہانِ کائنات

وہ منبع حرارت ایماں وہ نور حق
فاروقؓ یعنی مہر درخشانِ کائنات

جس کا جلال فتح مہمات کی کلید
جس کی نگاہ جنبشِ مژگانِ کائنات

وہ جس کے مشوروں پہ رسالت کو اعتماد
وہ چارہ ساز خلق وہ درمانِ کائنات

وہ جس کا عدل مشعل ارباب سلطنت
وہ جس کا عہد وجہ چراغانِ کائنات

ان دو کے بعد تاجِ خلافت کا مستحق
وہ شمع مصطفیٰ تہ دامانِ کائنات

ختنِ نبی وہ صاحب نورین وہ غنیؓ
سیراب جس کے فیض سے پاکانِ کائنات

جس کی چمک سے تاجِ خلافت کو افتخار
وہ آبدار گوہر عمّانِ کائنات

طاقت کے ساتھ صبر و تحمل کا یہ کمال
کرتے ہیں اس پہ رشک شہیدانِ کائنات

ان سب کے بعد اوجِ امامت کا آفتاب
وہ بوترابؓ چارم ارکانِ کائنات

وہ قاسم نیوض در علم مصطفےٰ
معمور جس کے نغموں سے ایوانِ کائنات

وہ جس کی شمع خانہ جگر گوشۂ رسول
وہ جس کے لال سنبل و ریحانِ کائنات

ناظرین غور کریں، فرق مراتب کا لحاظ رکھتے ہوئے اصحاب رسول کے فضائل و مناقب کی کتنی صحیح تصویر ہے! "سنبل و ریحان" کی لطافت تشبیہ پر بھی ذوق سلیم کو وجد آجائے تو کچھ تعجب نہیں،

سہیلؔ نے منقبت میں جی کھول کر متعدد نظمیں لکھی ہیں، افسوس ہے کہ طوالت کے خیال سے ہر نظم کے اشعار پیش کرنا مشکل ہے، پھر بھی ارباب ذوق کی مزید ضیافت ذوق کے لیے خاص طور پر ایک اور نظم کے چند اشعار پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

یہ جتنے اصحاب مصطفیٰؐ تھے سب اہل ایماں کے مقتدا تھے
یہی وہ سرچشمۂ ہدیٰ تھے کہ جن سے سب فیض پا رہے ہیں

خصوصیت سے جو سابقین تھے حضور انورؐ کے جانشیں تھے
یہ چار ارکان قصر دیں تھے مراتب انکے سوا رہے ہیں

پھر انمیں صدیقؓ سب سے فائق فروغ حق ہمراہ الحقائق
نبی کے بعد افضل الخلائق میان ارض و سما رہے ہیں

ملا رضا کا پیام ان کو خدا نے بھیجا سلام انکو
خود انبیاءؑ کے امام ان کو امام اپنا بنا رہے ہیں

قبول ایماں میں اولیت وہ خلوت ثور کی معیت
عیاں ہے قرآن سے افضلیت خطاب صاحب کا پا رہے ہیں

دفعۃً مدینہ یاد آجاتا ہے تو کس والہانہ جوش سے خطاب کرتے ہیں:

مبارک اے طیبۂ مطہر تری زمیں مہر و مہ سے برتر
کہ محفل کن فکاں کے سرور دیار تیرا بسا رہے ہیں

پھر فاروق اعظمؓ کے کوکبۂ جلال و عظمت کی طرف نگاہ عقیدت اٹھتی ہے تو یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں،

تحیت و شکر کے ترانے ملائکہ آج گا رہے ہیں
در رسالت پہ سر جھکانے جناب فاروقؓ آ رہے ہیں

وہ دین حق کی اساس محکم، وہ قصر ایماں کا رکن اعظم
وہ جس کو خود مقصد دو عالم بصد تمنا بلا رہے ہیں

فضا میں رقصاں ہے حق کا پرچم بتوں میں برپا ہے بزم ماتم
ہوا وہ باران نور پیہم کہ بام و در جگمگا رہے ہیں

عمرؓ کی آمد کا غلغلہ ہے تو قصر کسریٰ میں زلزلہ ہے
عجم کے والی لرز رہے ہیں حرم کے بت لڑکھڑا رہے ہیں

یہ عدل فاروقؓ کا ہے منظر کہ سطح انساں ہوئی برابر
شہ یمن کے ہیں آج ہمسر ابھی جو کل تک گدا رہے ہیں

یہ شمع بزم حرا کی ضو ہے یہ برق روحانیت کی رو ہے
عجم تک آواز جا رہی ہے عرب میں خطبہ سنا رہے ہیں

بیت المقدس کے سفر کا سماں جس طرح پیش کیا ہے، غالباً اس سے بہتر کوئی پیرایۂ بیان مشکل سے مل سکتا ہے، ملاحظہ ہو،

نہ دور و نزدیک تیغ و خنجر نہ ساز و سامان نہ لاؤ لشکر
خدا کی رحمت ہے سایہ گستر ملائکہ پر بچھا رہے ہیں

فضا میں گونجی ہیں مرحبا کی صدائیں چلے ہیں فاروقؓ اس ادا سے
جو ذرے اڑتے ہیں گرد پا سے نجوم پر مسکرا رہے ہیں

افسوس ہے کہ انداز بیان کی یہ رعنائی اب دیکھنے میں نہ آئے گی!

اس موقع پر حضرت عمرؓ کے سفر شام کے متعلق سہیل کے محترم استاد علامہ شبلی کا وہ عدیم المثال

فقرہ بے اختیار یاد آگیا جس کی شان بلاغت پر سیکڑوں نظمیں نثار کی جا سکتی ہیں، فرماتے ہیں:

"عمر فاروقؓ کے سفر شام میں سواری کے ایک اونٹ کے سوا اور کچھ نہ تھا، لیکن چاروں طرف غل پڑا ہوا تھا کہ مرکز عالم جنبش میں آگیا ہے"۔

یہ انشاء پردازی کی معراج ہے، دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالے جائیں، تب بھی سطوت فاروقی کا یہ سماں جو اس ایک مختصر فقرے سے ادا ہو گیا ہے نظر نہیں آسکتا، وسیع سے وسیع تخیل کے لیے بھی اس سے بلیغ تر انداز بیان کی جستجو بے کار ثابت ہوگی،

محترم استاد کی مدح سرائی کا یہ موقع نہیں ہے کہ ابھی لائق شاگرد کے متعلق کچھ اور کہنا ہے سہیل کے زخمۂ اخلاص و عقیدت نے نعت و منقبت کے ساز لاہوتی کو جس انداز سے چھیڑا ہے، اس کی ندرت اور جوش و لطافت کا اندازہ ارباب ذوق نے مذکورہ بالا اشعار سے کر لیا ہوگا، اور جو آسمانی نغمے اس سے نکلے ہیں، ان کو سن کر نہ صرف سامعہ تسنیم و کوثر کی موجوں میں ڈوب گیا ہوگا، بلکہ قلب و روح کے لطیف ترین احساسات بھی بیدار اور شگفتہ ہو گئے ہوں گے،

سہیل کا یہ دعویٰ

سہیل رندوں سے کہہ دو آئیں قلوب کی تشنگی بجھائیں
رحیق مختوم منقبت کی گلابیاں ہم لنڈھا رہے ہیں

حق و انصاف کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ دعویٰ ہرگز ناموزوں نہیں ہے،

سہیل کے مذہبی جوش و خروش کے تماشا گاہ سے رخصت ہونا چاہتا تھا کہ یکایک ان کے ایک اور خاص قصیدہ پر نظر پڑ گئی، جو انھوں نے حضرت امام حسینؓ کی منقبت میں سپرد قلم کیا تھا، ظلم ہوگا اگر تشنگان ذوق کو اس جام طہورہ کے جرعہ ہائے جاں نواز سے محروم کر کے قلم کا رخ کسی اور طرف پھر جائے، تمہید کے چند اشعار نقل کرتا ہوں، فکر و نظر کی بلندی ملاحظہ ہو،

اے کہ فنائے ذات حل ترے طلسم راز کا
زخم جگر دریچہ ہے تیری نگاہ ناز کا

کیا ہے نوا بس اک فسونِ نگاہِ ناز کا
کیا ہے نقاب بس اک فریبِ نرگسِ نیم باز کا

ایک نوائے کن فقط رقص کناں ہے چار سو
دہر نہیں یہ سحر ہے مطربِ نے نواز کا

المدد اے جنونِ شوق دے مجھے درسِ بیخودی
صفحۂ دل سے محو ہو نقش تو امتیاز کا

میں بھی حریف بن سکوں دُرد کشانِ درد کا
میں بھی شریک ہو سکوں خلوتیانِ راز کا

تو بھی اب اے کمندِ شوق رہبرِ بامِ دوست بن
حوصلہ پست ہو چکا عقلِ سپہر تاز کا

دور سپہر ایک گام چشمۂ مہر عکسِ جام
بادیہ گردِ شوق کا، بادہ کشِ نیاز کا

لغزشِ ناتمام ہے جس کا رکوع نام ہے
بیخودیِ دوام ہے سجدہ مری نماز کا

خود ہی تو زخمۂ نہاں چھیڑ رہا تھا تارِ جاں
مجھ سے یہ کیوں پھر امتحان نغمۂ دل گداز کا

جذبِ نظر کی کیا خطا دستِ جنوں کا جرم کیا
آپ ہی بے قرار تھا پردہ حریمِ ناز کا

سوختگی ہے پیش کش بارگہِ جلال کی
طور اداشناس تھا برقِ نظر گداز کا

کیا ان اشعار کو پڑھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ایک مدبا خبر عالمِ سرور میں خلوتیانِ راز سے ہمکلام ہے۔

اصل موضوع کے متعلق بھی دو چار شعر سننے کے قابل ہیں، کہتے ہیں

یومِ ولادت آج ہے سیدِ پاکباز کا
غیب سے باغِ دہر کو حکم ہے اہتزاز کا

ذوقِ سناں چشی نے دی دعوتِ تیغ سرمدی
آج قدوم ہے اسی سیدِ سرفراز کا

جس کی ادائے دلربا مظہرِ شانِ کبریا
وہ گلِ ارغواں قبا گلکدۂ حجاز کا

تشنۂ دشتِ کربلا کشتۂ خنجرِ جفا
بندۂ سجدگی ادا ایزدِ بے نیاز کا

سینہ وہ [illegible] ذکرِ حق [illegible] کے ورق
دل وہ خزینہ نور کا سینہ سفینہ راز کا

[illegible] اس سے زیادہ لطیف تشبیہ کس کے ذہن میں آسکتی ہے، آخر میں کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں

[illegible] سہیل [illegible] قبول مل گیا
حشر میں اوج دیکھنا پیشکش نیاز کا

سہیل کے اس پیشکشِ نیاز سے ناظرین ابھی گھبرائے نہ ہوں گے، مجھ سیہ کار کو خود ان روحانی نغموں کے سنانے میں جو لذت محسوس ہو رہی ہے، وہ قلم کو آگے بڑھنے سے مانع ہے، مانع کیوں نہ ہو، کتنی بڑی ناانصافی ہے کہ بیٹے کی تعریف تو ناظرین کو سنا دی اور باپ کی شان میں سہیل نے محاسنِ شعری کے ساتھ جو ثنا خوانی کی ہے، اس کو نظر انداز کر کے کوئی اور داستان چھیڑ دوں، چند اشعار اس قصیدہ کے بھی سن کر ناظرین اپنے ایمان کو تازہ کر لیں، کہتے ہیں:

غرۂ ماہ رجب کا آج ہے یوم الکمال
وہ مکمل شانِ استخلاف کا پیدا ہوا

سرخیِ خونِ شہادت جس کے عارض پر نثار
جو ازل سے لالۂ رنگیں قبا پیدا ہوا

چاندنی چھٹکی زمانے میں اجالا ہو گیا
دینِ کامل کا مہِ برجِ علا پیدا ہوا

ظلمتِ کفر و ضلالت کیوں نہ لے راہِ گریز
آفتابِ آسمانِ مصطفیٰ پیدا ہوا

چاندنی لاتی ہے کس کے خیر مقدم کی خبر
مرحبا کا غل زمیں سے تا سما پیدا ہوا

شادیانے گا رہے ہیں طائرانِ نغمہ سنج
عید میلادِ علیؑ کا غلغلہ پیدا ہوا

شبنمستانِ جہاں میں غنچہ گر چٹکا کوئی
برگِ گل سے نغمۂ صلِّ علیٰ پیدا ہوا

خازنِ علمِ لدنی حاملِ اسرارِ وحی
کنزِ عرفاں مشعلِ راہِ ہدیٰ پیدا ہوا

یہ نہایت طویل قصیدہ ہے، جو شروع سے آخر تک جوشِ معانی سے لبریز ہے، جیسا کہ سہیل نے خود مقطع میں کہا ہے اور بالکل سچ کہا ہے،

کوثرِ معنی لبوں سے خود ابل اٹھا سہیل
جب دلِ مداح میں جوشِ ثنا پیدا ہوا

یہ شاعرانہ تعلی نہیں ہے، بلکہ ایک حقیقت ہے، جس سے کوئی صاحبِ ذوق انکار نہیں کر سکتا، ممکن ہے کہ زمانہ کسی وقت سہیل کے اور ترانہائے سخن کو بھلا دے، لیکن انکا چمنستانِ شاعری جس کے کچھ گلہائے رنگین ہدیۂ ناظرین کر چکا ہوں، ابدی اور لازوال تابانیوں کا حامل ہے،

اس کا پیکر جمال کبھی غبار آلود نہیں ہو سکتا، وہ بہار سرمدی کا گہوارہ ہے، جس کو باد خزاں کے جھونکے کبھی ہاتھ نہیں لگا سکتے، سہیل اپنے اس مقدس سرمایۂ سخن کے متعلق بجا طور پر کہہ سکتے تھے۔

سالہا گوشِ جہاں زمزمۂ خواہد بود　　زیں نواہا کہ دریں گنبد گرداں زدہ ام

سہیل کے مذہبی احساس کی حرارت نے شاعری کے میدان میں وادی ایمن کی شرربار یوں کا جو منظر پیش کیا تھا، اس کو ناظرین نے دیکھ لیا لیکن یہ نہ سمجھیں کہ وہ جس دنیا کے انسان تھے اس کے واقعات و مناظر کی ان کو خبر نہ تھی، وہ فرشتہ نہ تھے کہ ہر وقت عالم بالا ہی سے رسم و راہ رکھتے اور ان غیر معمولی قومی اور سیاسی حالات سے بے خبر رہتے، جو خود ان کی نگاہوں کے سامنے ظہور میں آتے رہے، وہ کوئی قومی اور سیاسی لیڈر نہ تھے، اور نہ ان میں اس کی فطرۃً صلاحیت تھی لیکن ان کا دل ان تمام جذبات کا آتشکدہ تھا جس کی شرر فشانیاں ان کی تمام قومی، ملی اور سیاسی نظموں میں علانیہ نظر آتی ہیں، ایک صحیح العقیدہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ غلامی کو سب سے بڑی لعنت اور آزادی کو سب سے بڑی نعمت سمجھتے تھے۔ فطرت انسانی کا یہی وہ شریفانہ جذبہ تھا، جو اکثر ان کے شاعرانہ احساس میں ایک بے پناہ ہیجان و اشتعال پیدا کر دیتا تھا، اور اس وقت ان کے قلم کی پر جلال صدائے حق سے ایوان باطل کے بام و در لرز اٹھتے تھے، غرض جذبات کا ایک قیامت خیز طوفان ان کے دل کی گہرائیوں سے اٹھ کر صفحۂ کاغذ پر چھا جاتا تھا۔

اگرچہ ملک کی سیاسی ہنگامہ آرائیوں میں انھوں نے کوئی عملی حصہ نہیں لیا، اور نہ ان کے بس کی یہ چیز تھی، لیکن ان کی شریفانہ طبیعت کا سیاسی میلان ہمیشہ کانگرس کی طرف رہا، صرف اس لیے کہ ان کا نصب العین ہندوستان کی مکمل آزادی کا حصول تھا، چنانچہ جب ملک کو غلامی کی لعنت سے نجات ملی تو انھوں نے متعدد نظموں کے ذریعہ سے اپنے جوش مسرت کا اظہار کیا، ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

گلزارِ وطن کی کوئی دیکھے تو پھبن آج　　سرشار ہے خوشبو سے ہر اک گشتِ چمن آج
غنچوں کا صبا توڑ گئی قفلِ دہن آج　　ہے ہر گلِ خنداں کی زباں پر یہ سخن آج
صد شکر کہ ٹوٹا درِ زندانِ محن آج

پھر موج نے ڈوبی ہوئی کشتی کو ابھارا　　بگڑی ہوئی تقدیر کو ہمت نے سنوارا
کھوئی ہوئی عظمت دہ ملی ہم کو دوبارا　　روشن ہے پھر آزادیٔ مشرق کا ستارا
یہ خوش خبری لائی ہے سورج کی کرن آج

رخصت ہے شبِ تارِ غلامی کا اندھیرا　　وہ سامنے ہے صبحِ سعادت کا سویرا
بھارت سے بدیسی کا اکھڑنے لگا ڈیرا　　لہرائے نہ کیوں عظمتِ قومی کا پھریرا
آزاد ہوا قیدِ غلامی سے وطن آج

آگے چل کر ملک کے ان جانبازوں کی خدمت میں اپنی نذر عقیدت پیش کی ہے، جن کی شاندار قربانیوں نے اس جہاد عظیم کو کامیاب بنایا تھا، افسوس ہے کہ طوالت کے خوف سے یہ تمام اشعار قلم انداز کرنے پڑتے ہیں، لیکن ایک بند ضرور سنانا چاہتا ہوں جس میں انھوں نے اس فتح عظیم کی بشارت ان خفتگانِ راہ عدم کو بھی دی ہے، جن کی ہمت و غیرت نے اس مقدس جنگ کا آغاز کیا تھا، ملاحظہ ہو، کس جوش سے کہتے ہیں:

اے بادِ صبا خواب سے ٹیپو کو جگا دے　　مرحوم ظفر شاہ کے شانے کو ہلا دے
پہلے تو ادب سے سرِ تسلیم جھکا دے　　پھر دونوں کو یہ مژدۂ جاں بخش سنا دے
آزاد ہے کشمیر سے لے تا بہ دکن آج

اس جوش و خروش کے عالم میں سہیل کی حکیمانہ نظر اس حقیقت پر بھی ہے کہ تعمیر تخریب سے زیادہ مشکل اور زحمت طلب ہوتی ہے، چنانچہ آخر میں ارباب وطن کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

اربابِ وطن تم کو مبارک ہو یہ محفل　　　ہاں جشن منا لو کہ ہے موقع اسی قابل

ہو نا نہ مگر جوشِ طرب میں کہیں غافل　　　تخریب تو آسان تھی تعمیر ہے مشکل

ہے سامنے منزل ابھی کل سے بھی کٹھن آج

سچ ہے کہ نہیں سب کے مذاہب بھی یہاں ایک　　　اور یوں بھی سمجھ لو کہ نہیں سب کی زباں ایک

پھر بھی تو وطن ایک ہے، اور سود و زیاں ایک　　　ہم سب کا خدا ایک ہے، ہم سب کا نشاں ایک

پھر دل میں ہو کیوں خارِ عداوت کی چبھن آج

وہ دھرم ہو ہندو کا کہ ہو مذہب اسلام　　　ہر دین تو دیتا ہے محبت ہی کا پیغام

مذہب کو خدا کے لیے مت کیجئے بدنام　　　کل شیر و شکر ہوں یونہی کل ہند کی اقوام

سنگم پہ ہیں جس طرح ملے گنگ و جمن آج

افسوس ہے کہ اس خیر خواہ وطن کی یہ صلاح نیک اب تک صدا بہ صحرا کی حیثیت رکھتی ہے، عمل تو در کنار، یارانِ وطن کو اس کا سننا بھی گوارا نہیں، ابھی تو دل میں صدیوں کا بھرا ہوا جوشِ انتقام ان کو ملک کی فلاح و ترقی سے غافل کیے ہوئے ہے، معلوم نہیں ان کی یہ سرگرانیاں کب تک رہیں گی، اور ان کا افقِ حیات جس پر تنگ نظری کا سیاہ بادل چھایا ہوا ہے، خلوص و محبت کی روشنی سے کب منور ہوگا! ملک میں چراغاں کر دینا کچھ مشکل نہ تھا، لیکن افسوس ہے کہ سہیل کا یہ مطالبہ "روشن کرو الفت کا دیا دل کے بھی اندر" اب تک پورا نہ ہو سکا، حالانکہ بغیر اس چراغ کو جلائے ہوئے وہ حقیقی امن و سکون جس پر ملک کی ہر ترقی کا انحصار ہے، کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔

مذکورۂ بالا اشعار اور نیز دیگر نظموں سے جو سہیل نے اس موضوع پر لکھی ہیں، ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کا سیاسی زاویۂ نگاہ کس قدر وسیع اور بلند تھا، وہ کس حد تک باہمی اتحاد و یگانگت کے حامی تھے، اور ان کا مذہبی احساس کتنا فیاض اور کشادہ تھا، یہ واقعہ ہے کہ وہ کسی فرقہ وارانہ

جماعت میں کبھی شریک نہیں ہوئے، ان کی نگاہ عقیدت اسی علم بغاوت کی طرف اٹھتی رہی جو سرفروشانِ وطن نے جبر و استبداد کے خلاف بلند کر رکھا تھا، ایک بلند نظر اور حقیقت شناس انسان ہونے کی حیثیت سے ان کو انسانیت کی جہاں بلندی نظر آتی تھی، اس کے سامنے بلا لحاظ قوم و مذہب ان کی جبین نیاز جھک جاتی تھی، چنانچہ مہاتما گاندھی، جواہر لال، تلک، آزاد، بھگت، محمد علی، موتی لال وغیرہ تمام جانباز اور حوصلہ مند ہستیوں کو والہانہ خلوص کے لہجہ میں انھوں نے یاد کیا ہے، جو ان کی فراخدلی اور حب وطن کا بہت بڑا ثبوت ہے، وہ ایسے مذہب کے پیرو تھے جس کی بیاض کا نام ایثار و قربانی ہے، اس لیے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اس جلوۂ روحانی کو قدر و عزت کی نگاہ سے نہ دیکھتے، خواہ اس کا مظہر کوئی پیکر انسانی ہو، وہ جس زندگی کی دعوت دیتے ہیں، اس کی شان کا اندازہ ذیل کے چند اشعار سے ہو سکتا ہے، کہتے ہیں:

اس طرف آئیں کہاں ہیں طالبانِ زندگی　　　ہے دمِ شمشیر خضر آستانِ زندگی

تو نفس کی آمد و شد کو سمجھتا ہے حیات　　　میں یہ کہتا ہوں وداعِ جان ہے جانِ زندگی

راحتِ کنجِ قفس سے زندگی کو کام کیا　　　بجلیوں سے کھیلتا ہے آشیانِ زندگی

کر تلاشِ کنجِ مرقد اے طلبگارِ سکوں　　　شورشِ پیہم کا طالب ہے جہانِ زندگی

ایک ٹھوکر مار دیتا ہے جہاں پائے طلب　　　خود ابلتا ہے وہاں سیلِ روانِ زندگی

رو پڑے راہ طلب میں جس جگہ دو آبلے　　　لہلہا اٹھا وہیں اک گلستانِ زندگی

سرفروشِ عشق کا جس خاک پر ٹپکے لہو　　　اس کے ہر ذرے سے پیدا ہو جہانِ زندگی

کچھ آگے چل کر ان کی اسلامی غیرت کا پر جوش جذبہ پیروانِ دین حنیف سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

فدیۂ جاں پیش کر اے پیروِ دینِ حنیف　　　ذوقِ قربانی ہے پہلا امتحانِ زندگی

استقامت کا سبق لے اسوۂ صدیقؓ سے　　　پھر زمانے کو سنا دے داستانِ زندگی

ہاں جنونِ شوق اٹھ پھر لے کے فانوسِ قلم — پھر دکھا دے دیدۂ عالم کو شانِ زندگی
خرمنِ باطل کو خاکستر بنا کر چھوڑ دے — ہر نفس تیرا ہو اک برقِ تپانِ زندگی

مبارک ہے وہ دل جو ان پاکیزہ جذبات کا حامل ہو، آفریں ہے اس زبان پر جو اسوۂ صدیق و فاروق کی پیروی کی دعوت دے، کہ بغیر اس پر عمل کیے ہوئے تہذیب مغربی کے پر فریب منظر کا تسلط ہماری نگاہوں سے زائل نہیں ہو سکتا، اور نہ ہم کو وہ اخلاقی و روحانی قوت نصیب ہو سکتی ہے، جس کے بل پر کبھی کچھ بے سر و سامان صحرا نشینوں نے اٹھ کر قیصر و کسریٰ کے شاہانہ غرور و تمکنت کو خاک میں ملا دیا تھا، مسلمان اگر اب بھی اسلام کے جادۂ حق پر چلنے کے لیے تیار نہیں ہیں، تو پھر ان کے قلب و جگر کو ذلت و رسوائی کی ٹھوکروں سے ملول نہ ہونا چاہیے، وہ قطعی طور پر یہ سمجھ لیں کہ ان کا ظلمت کدۂ حیات صرف اسی آفتاب ہدایت کے فیضانِ تجلی سے منور ہو سکتا ہے، جو نامحدود تابانیوں کے ساتھ حجاز کے صحرائے دراں سے طلوع ہو کر جلوہ آرائے کائنات ہوا تھا، طلب صادق ہو تو آج بھی اس کی ضوفشانیاں آمادۂ کرم ہیں۔ خوفِ ماسوا دلوں سے دور ہو، تو آج بھی ہمارا نعرۂ توحید قصر باطل کے کنگروں کو ہلا سکتا ہے، اور پھر کسی فتنۂ روزگار کو ہم سے الجھنے کی ہمت نہیں ہو سکتی، سہیل کے ایک قدیم قصیدہ کے ایک شعر کا صرف ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے، جس کو مسلمان سن لیں اور غور کریں کہ اسلام کی اصل تعلیم کیا تھی، اور اس کو بھلا کر وہ کس قدر پست اور مبتذل ہو رہے ہیں، وہ مصرعہ یہ ہے:

کسی سے جز خدا ڈرنا خلافِ آدمیت ہے

اہل نظر غور کریں، تو یہ مصرعہ نہیں ہے، بلکہ ایک موجِ برق ہے، جس سے ایمان و غیرت کی رگیں دفعۃً مشتعل ہو جاتی ہیں، اور دماغ کچھ یوں بلند ہو جاتا ہے، کہ دنیا کی تمام بلندیوں کو اس کے سامنے مجبوراً جھک جانا پڑتا ہے، اور بڑے بڑے کج کلاہوں کے قدم قریب آنے سے لرز اٹھتے ہیں، خیالات کا تموج بھی عجیب چیز ہے، قلم کو کہاں سے کہاں لے جا رہا ہے، وعظ و پند کا یہ موقع نہیں

مقصود تو یہ کہنا ہے کہ سہیل اگرچہ محبِ وطن تھے کہ حبِ وطن بھی انسانیت کا ایک شریفانہ جذبہ ہے، لیکن وہ ان مسلمانوں میں نہیں تھے، جو کسی مصلحت سے اپنے کو صرف ہندستانی کہہ کر رہ جاتے ہیں، اور مسلمان کہنے کی ہمت نہیں رکھتے، سہیل نے جی کھول کر اپنے جذبۂ اسلامی کا علانیہ اظہار کیا ہے، خصوصاً ترکوں کی شاندار فتحِ سمرنا کے مبارک موقعہ پر انھوں نے اپنے جذبات کے ربابِ آتشیں کو جس جوش و خروش کے ساتھ چھیڑا ہے، اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس مشتِ پر میں آخر تڑپنے کی طاقت کہاں تک تھی، ممکن ہے کہ اور بھی دل اس حرارت ایمانی سے محروم نہ ہوں، لیکن قلم کا یہ کمال نظر آئے گا کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی سوختہ جاں نے صفحۂ کاغذ پر بجائے الفاظ کے دہکتے ہوئے انگارے بچھا دیے ہیں،

ایک مرد جانباز نے دولت عثمانی کے غارت گروں کو عزم و استقلال اور ایثار و غیرت کا جو حیرت انگیز منظر دکھایا تھا، وہ اسی قسم کے بلند اور شریفانہ جذبات کو ابھار سکتا تھا جن کا اظہار سہیل نے اپنی نظم موسومہ "فتح سمرنا" میں کیا تھا، اب اس نغمۂ آتشیں کو ان ہی کی زبان سے سننے میں لطف ہے، آغاز کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، کس جوش سے کہتے ہیں:

دمِ شمشیر پہلا زینہ ہو معراجِ ایماں کا — یہ ایما مسلموں کو ہے ہلالِ عیدِ قرباں کا

اس مطلع کے بعد جس میں بہت کچھ کہہ دیا گیا ہے، کچھ اور کہنے کی ضرورت نہ تھی لیکن جو طوفان دل سے اٹھ چکا ہے، اس کو اب کون روک سکتا ہے، اس کی رفتار کا یہ عالم ہے:

گئے وہ دن کہ تھی مقبول اک دنبے کی قربانی — متاعِ جاں اب دونی ہدیہ ہے سرکارِ جاناں کا
سدا اہلِ وفا کی آزمائش ہوتی آئی ہے — اچھوتا کچھ نہیں منظر یہ بازی گاہِ دوراں کا
وجودِ قوم اب تک مبتلائے صرعِ غفلت تھا — سنگھانا تھا اسے اک لخلخہ خونِ شہیداں کا
مصائب نے اب آنکھیں کھول دیں اپنی تو یہ سمجھے — کہ زنداں تھا دبستانِ سیاست ماہِ کنعاں کا

بقائے جاوداں ملتی ہے جانبازانِ ملت کو / ہمیں اب یاد آیا یہ سبق تعلیمِ قرآں کا

حیاتِ سرمدی چاہے تو اس ہستی کو باطل کر
کہ دانا بارور ہوتا ہے پہلے خاک میں مل کر

دوسرے بند میں جوشِ غیرت سے بے تاب ہو کر یوں خطاب کرتے ہیں،

مصیبت پر مسلماں شکوہ سنجِ آسماں کیوں ہو / نہ ہو یہ آنچ تو کھوٹے کھرے کا امتحاں کیوں ہو
چٹانیں کفر و باطل کی اگر اس سے نہ ٹکرائیں / تو طوفاں خیزیوں اسلام کا سیلِ رواں کیوں ہو
ازل سے ناوکِ قاتل امانت اہلِ دل کی ہے / حوادث کا گلہ کیوں ہو مصائب پر فغاں کیوں ہو
لہو کی چند بوندیں جو نہ دے سکتا ہو ملت کو / وہ بزدل آرزومندِ حیاتِ جاوداں کیوں ہو
ہمارا داغِ سجدہ نورِ سیمائے ملائک ہے / ہمارا سجدہ گہ غیروں کا سنگِ آستاں کیوں ہو
شعاعِ برق امیں ہے یہاں ہر خس نشیمن کا / جلا دے جسکو بجلی وہ ہمارا آشیاں کیوں ہو
خدائے دو جہاں کی مہربانی ہم کو کافی ہے / کوئی پروردۂ تثلیث ہم پر مہرباں کیوں ہو

کوئی جا کر یہ کہدے ناصحِ فرخندہ آئیں سے
جنونِ آرزو بہتر ہے عقلِ مصلحت بیں سے

اللہ اکبر! بظاہر ایک رندِ بے خبر کتنا باخبر نظر آ رہا ہے!! جبہ و دستار کا پتہ نہیں، شیخ و زاہد کی صحبت سے بھی محروم، لیکن جب زبان کھلتی ہے تو اسرار و حکم کے انمول موتی جھڑنے لگتے ہیں، اور بے اختیار خواجہ حافظ کا شعر یاد آ جاتا ہے،

سرِ خدا کہ عارفِ سالک بکس نگفت / در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

اب وہ جنونِ آرزو جس کے بغیر زندگی کی پر خطر راہوں میں پا بر جا رہنا ناممکن ہے سہیل کے دل میں جس طرح ہنگامہ آرا ہو گیا ہے، اس کا منظر بھی دیکھنے کے قابل ہے، یہ تڑپتی ہوئی بجلیاں ملاحظہ ہوں:

اگر دنیا میں رہتے ہیں تو دنیا کو دکھا دیں گے / کہ یا خود مٹیں گے یا حریفوں کو مٹا دیں گے
رگِ جاں مدتوں سے تشنۂ شوقِ شہادت ہے / ہم اس کی پیاس آبِ تیغِ عریاں سے بجھا دیں گے
کفن سادہ پہننا ننگ ہے رنگیں مزاجوں کو / ہم اس پر داغہائے خون سے گل بوٹے بنا دیں گے
رہے گی تا کجے افسردگی گلزارِ ملت پر / ہمارے خون کے چھینٹے اسے نشو و نما دیں گے
جہاں میں دینِ بیضا شمع ہے نورِ الٰہی کی / یہ جھونکے بادِ مغرب کے اسے کیوں کر بجھا دیں گے
الٹ دیں گے مرقع پھر بساطِ کفر و باطل کا / فروغِ ملتِ بیضا سے محفل جگمگا دیں گے

مٹے ہر چند ہم پھر بھی سلف کی شان باقی ہے
رگوں میں اب بھی خونِ طغرل و عثمان باقی ہے

اب اس خون کی حرارت ان کو سلف کی یاد دلاتی ہے،

وہی ہیں ہم کہ جب اٹھے علم توحید کا لیکر / یکایک زلزلہ سا آ گیا ایوانِ کسریٰ میں
ابھی بھولے نہیں ہم خالد و طارق کے افسانے / فتوحاتِ صلاح الدین ابھی روشن ہیں دنیا میں

کیوں نہ روشن ہوں کہ پھر ایک مدت کے بعد افقِ سمرنا پر اسی برقِ باطل سوز کا جلوہ نظر آ رہا ہے، جسکو دیکھ کر سہیل اپنے جوشِ مسرت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں

زمانے نے ورق الٹا ہے پھر تاریخِ ماضی کا / وہ پہنچا پرچمِ اسلام پھر ارضِ سمرنا میں
اُدھر ترکانِ غازی فاتحانہ بڑھتے جاتے ہیں / ادھر اک کھلبلی سی مچ رہی ہے فوجِ اعدا میں
نویدِ فتحِ اسلامی نشاط انگیز ہے کتنی / نہ کیفیت یہ نغمے میں نہ مستی ایسی صہبا میں
دلوں میں اس طرح بیتاب ہے جوشِ شادمانی / کہ جیسے موجِ صہبائے کہن مضطر ہو مینا میں

آخری شعر کی شعریت ملاحظہ ہو،

صبا نے وہ تگ و دو کی ہے اعلانِ مسرت میں / کہ ٹپکا ہے پسینہ جا بجا شبنم کی صورت میں

جس مجاہدِ اعظم کی ضربتِ ذوالفقار سے جبر و استبداد کا ابرِ محیط پھٹ کر ترکانِ عثمانی کا آفتابِ اقبال ایک دفعہ پھر افقِ عالم پر جلوہ گر ہو گیا تھا اور جس کے نعرۂ حق سے لشکرِ باطل کی تمام صفیں ٹوٹ کر رہ گئی تھیں، اسکے قدموں پر سہیل نے اخلاص و محبت کے جو پھول نثار کیے تھے، ان کے رنگ و بو سے بھی ناظرین اپنے مشامِ روح کو تازہ کریں، یہ ایک علیٰحدہ ترکیب بند ہے، جس کے چند آخری اشعار پیش کرتا ہوں،

باطل فتنہ ساز کو حق سے شکست ہو گئی ۔۔۔ خیر سے آج سر ہوا مسئلہ نور و نار کا

رافعِ پرچمِ ہلال، غازی مصطفےٰ کمال کی ۔۔۔ یعنی وہ اک مجسمہ ہمتِ استوار کا

صلِّ علیٰ و حبذا لمعۂ تیغِ مصطفےٰ ۔۔۔ پھیر دیا ہے جس نے منہ فتنۂ روزگار کا

جس نے بلند کر دیا جذبۂ حریت کا نام ۔۔۔ جس نے نشاں مٹا دیا غیر کے اقتدار کا

سبزۂ پائمال کو جس نے نہال کر دیا ۔۔۔ جس نے سماں دکھا دیا گذری ہوئی بہار کا

بسمل جاں بلب کو پھر جس نے حیات تازہ دی ۔۔۔ حوصلہ پھر بڑھا دیا ملتِ دل فگار کا

پہلے بند کا آخری شعر فارسی میں لکھ دیا ہے، پڑھکر وجد کرنے کو جی چاہتا ہے، ملاحظہ ہو:

مژدۂ نصرت کمال باز بگوش جاں رسید ۔۔۔ طرۂ پرچم ہلال باز بہ آسماں رسید

ناظرین غور کریں، فتح و نصرت کا یہ مژدۂ جاں بخش جس کی بظاہر کوئی امید نہ تھی، کس کی بدولت سننے میں آیا تھا، یہ وہی جنونِ آرزو ہے جسکو سہیل نے صحیح طور پر عقلِ مصلحت اندیش سے بلند تر قرار دیا ہے، اور جس سے آج مسلمان دم بخود، افسردہ، پست، اور کم حوصلہ ہو گیا ہے، اب گرد راہ بھی اس کے دامنِ حیات سے شوخیاں کرتی ہوئی پھرتی ہے، حالانکہ یہ وہی بندۂ توحید ہے جس کے جلالِ نظر سے برقِ حوادث کو ہمیشہ شرمندہ ہونا پڑتا تھا،

یہ شعر جو میں نے ابھی اوپر نقل کیا ہے، قلم کے رخ کو سہیل کی فارسی شاعری کی طرف پھیرنا چاہتا تھا، لیکن کیا کروں ابھی ناظرین کو سہیل کے چمنستانِ تغزل کی سیر کرانا باقی ہے،

(باقی)

عہدِ جہانگیری کا ایک اہم مصنف و شاعر

یعنی

تقی اوحدی اصفہانی صاحبِ عرفات العاشقین

از

جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب لکھنؤ یونیورسٹی

(۴)

تصنیفات تقی اوحدی بڑا پر گو شاعر اور زبردست مصنف تھا، جس نے تیس ہزار کے قریب اشعار لکھے، اور متعدد نثری تصنیفات یادگار چھوڑیں جن میں سے بیشتر کا نام تک مٹ چکا ہے، خوش قسمتی سے کعبۂ عرفان میں مصنف نے اپنی تصنیفات کی مکمل فہرست دیدی تھی، جس کو مؤلف گلدستہ[1] نے بعینہٖ نقل کر دیا ہے، وہ تصنیفات حسبِ ذیل ہیں،

(۱) مثنویات۔ تقی نے سات مثنویوں کا ایک سلسلہ پیش کیا تھا، جو حسبِ ذیل عنوان سے نظم ہوئیں، اور جن کی ترتیب بہ اعتبارِ زمانی ہے،

(۱) یعقوب و یوسف[2] (۲) ساقی نامہ موسوم بہ نشاء بے خمار[3] (۳) کعبۂ دیدار[4] (۴) سفینۃ السکینۃ

---

[1] گلدستہ ورق ۹۰ ب [2] صحف ابراہیم (ص ۲۸۸) میں یوسف و یعقوب ہے، صبح گلشن (ص ۸۸) میں نام تو متن جیسا ہے، مگر اسے ایک رسالہ قرار دیکر صراحۃً مثنوی کی فہرست سے خارج کر دیا، [3] صحف ابراہیم میں نشئہ و خمار دیا ہے، گر ابیر سرنگو (ص ۵۰ فٹ نوٹ) اور بلند (ج ۲ ص ۱۳۵) نے نشاء و خمار دیا ہے جو صحیح نہیں ہے، [4] صبح گلشن (ص ۸۸) میں رسالہ کعبہ مراد لکھا ہے،

(۵) کعبۃ الحرمین (۶) لوح محفوظ (۷) قلم قدرت۔

(ب) قصائد و غزلیات کے گیارہ دیوان مکمل کیے جن کی فہرست حسب ذیل ہے:

(۱) دیوان قصائد مسمی بہ نصرۃ العارفین (۲) دیوان غزل موسوم بہ تذکرۃ العاشقین (۳) دیوان تراکیب و ترجیعات (۴) دیوان مقطعات و مطائبات و اہاجی و رباعیات اضافیہ و اوصافیہ (۵) دیوان عین الحیات یعنی بدانچہ در ہند گفتہ شدہ سوائے مثنوی[۱] (۶) دیوان امید آباد در جواب اشعار امیدی (۷) دیوان آدمیت[۲] (۸) دیوان غزل موسوم بہرام وستان (۹) دیوان قند مکرر جو شیر و شکر کے نام سے بھی موسوم ہے (۱۰) دیوان جواہر و زواہر (۱۱) دیوان درر و غرر، (آخری دو دیوان قصائد پر مشتمل ہیں)

(ج) نثر میں حسب ذیل کتابیں اوحدی کی تصنیف سے ہیں:

(۱) سرمۂ سلیمانی۔ جو بقول مصنف لغات فارسی و دری پر مشتمل ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تقی کو نہ صرف فن لغت سے بلکہ خالص فارسی سے کس قدر دلچسپی تھی۔ اس کتاب کا نام اسپرنگر[۳] نے بلند کے حوالے سے سرمۂ سلیمان لکھا ہے، ایک عجیب بات یہ ہے کہ بلند[۴] نے اس کا ماخذ برہان قاطع کو بتایا ہے، اور اسی کی بعینہ پیروی اسپرنگر[۵] اور عبد المقتدر (مرتب) بانکی پور کیٹلاگ[۶] دونوں نے کی ہے

---

[۱] اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے قیام میں مثنوی بھی لکھی تھی۔ چونکہ مثنویات باعتبار ترتیب زمانی دی گئی ہیں، اسلیے کم از کم قلم قدرت کو ہندوستان کی تصنیف ماننا پڑے گا [۲] ۵ و تا ۱۱ فہرست میں (جو باعتبار ترتیب مانی ہے) نثر کے بعد ہے اس لیے ان کو ہندوستان ہی کا کلام ماننا پڑے گا، عجیب سی بات یہ ہے کہ پوری فہرست سے دیوان رباعیات خارج ہے، حالانکہ اسپرنگر نے جس نسخہ کا حوالہ دیا ہے اس میں ۴۴ صفحے میں رباعیات ہیں، کیا عجب کہ یہی دیوان رباعیات کا ہو [۳] اودھ کیٹلاگ ص ۹۵ حاشیہ، نیز ملاحظہ ہو جرنل ایشیاٹک سوسائٹی (لندن) ج ۹ (۱۸۴۸) ص ۱۳۵ [۴] ایضاً [۵] اودھ کیٹلاگ ص ۹۵ [۶] فہرست بانکی پور ۸۵ (فارسی مخطوطات) ص ۱۱، مثلاً بلند اور اسپرنگر کے الفاظ ملاحظہ ہوں: He also Composed a Persian Dictionary called سرمۂ سلیمانی founded on The برہان قاطع

بلند نے اس روایت کا ماخذ صحف ابراہیم کا یہ جملہ ہے:[۱] "کتابے در لغت موسوم بہ سرمۂ سلیمانی کہ ماخذ برہان قاطع است تصنیف نمودہ"۔ بظاہر ماخذ کے کسرۂ اضافت کے نظر انداز کرنے اور اسکو ماخذش کا مترادف قرار دینے سے یہ غلطی واقع ہو گئی، حالانکہ برہان کا مصنف محمد حسین التبریزی المتخلص بہ برہان ہے، جس نے ۱۰۶۲ھ[۲] میں عبد اللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے عہد میں مرتب کیا، سرمۂ سلیمانی کا سنہ تکمیل ۱۰۱۳ھ[۳] تا ۱۰۲۴ھ کے درمیان میں سمجھنا چاہیے، اس لیے اس کا ماخذ ۱۰۶۲ھ کے لغت کو بتانا بڑی بے خبری کا پتہ دیتا ہے، بات در اصل یہ ہے کہ خود صاحب برہان نے سرمۂ سلیمانی کو نہ صرف اپنے ماخذ میں شامل کیا ہے، بلکہ کتاب کے ستر اجزا کو داخل کر لیا ہے، چنانچہ اس حقیقت کی طرف صحف ابراہیم کے مصنف نے بھی اشارہ کر دیا ہے، اور جس کو ابھی ابھی ہم لکھ چکے ہیں،

سرمۂ سلیمانی مولف عرفات کے قیام اصفہان کی یادگار ہے، اس سلسلے میں خود تقی نے ایک دلچسپ روایت درج کی ہے، جب تقی نے اصفہان میں سرمۂ سلیمانی مکمل کی تو سرودی نے اپنی تصنیف مجمع الفرس سے سرقے کا الزام لگایا، اور اصفہان کے حاکم مرزا محمد وزیر خراسانی کی طرف رجوع کیا، تقی لکھتا ہے "حاکم نے الٹے سرودی پر ایسی لعن طعن کی کہ اسے اصفہان چھوڑنا پڑا"۔ اور جب تقی اصفہان سے ہندوستان چلا آیا تو سرودی کاشان سے اصفہان آسکا، مجمع الفرس ۱۰۰۸ھ[۶] میں مرتب ہو کر شاہ عباس کے نام معنون ہوئی،

---

[۱] ص ۲۸۸ [۲] انڈیا آفس ص ۲۲ "کتاب نافع برہان قاطع" سے سنہ تالیف نکلتا ہے [۳] دیباچہ عرفات [۴] ص ۲۸۸ اور بانکی پور کیٹلاگ ج ۸ ص ۲۷ [۵] بانکی پور کیٹلاگ ج ۸ ص ۲۲ و عرفات ورق ۱۳۲۱ [۶] سرودی نے ۱۰۲۳ھ میں جمال الدین حسین انجو کی مشہور کتاب "فرہنگ جہانگیری" کی مدد سے ایک دوسرا اڈیشن تیار کیا، جسکی تفصیل اس اڈیشن کے تمام نسخوں کے سرورق پر موجود ہے، سرمۂ سلیمانی کا تعلق پہلے ہی اڈیشن سے ہے، سرودی عہد جہانگیری کے اواخر میں ہندوستان بھی آیا تھا، ۱۰۳۶ھ میں اسکے لاہور پہنچنے کی اطلاع ہے، حالات کے لیے ملاحظہ ہو ریو ج ۲ ص ۴۹۰، اسپرنگر ص ۲۲، ریاض الشعراء (حالات سرودی) صحف ابراہیم ص ۱۳۱، وغیرہ)

اس سے مجمع الفرس کا تقدم سرمۂ سلیمانی سے ثابت ہو گیا، اس لحاظ سے آخر الذکر کی تکمیل کا سنہ ۱۰۰۹ھ کے بعد کا سمجھنا چاہیے، کیونکہ اسی سنہ میں تقی پانچ سال کے بعد اصفہان واپس آیا ہے، اور ۱۰۱۴ھ تک اس کا قیام اصفہان میں ثابت ہے، اس لیے سہروردی سے اختلاف اور آخر الذکر کی جلاوطنی کا واقعہ اس سنہ سے قبل واقع ہو چکا ہوگا، اس لیے اس سرمۂ سلیمانی[۱] کا سنہ تصنیف ۱۰۱۳ھ کے قریب کا زمانہ ہوگا،

[۲] کافیۃ القافیہ و رد و ش سخن۔ ممکن ہے یہ کتاب علم عروض سے متعلق رہی ہو،

[۳،۴] مفاتح مفاتیح و علینہ۔ دونوں جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، تصوف پر ہیں، مگر خود مصنف کے زمانہ ہی میں یہ کتابیں تلف ہو گئیں، اور ان کا کوئی نسخہ مصنف کے پاس نہیں رہ گیا تھا، اس کی تصنیف سے مصنف کا شغف تصوف سے ثابت ہوتا ہے، جو اسے ورثہ میں ملا تھا،

[۵] جفر اوحد، علم جفر پر مصنف نے اسے "از غرائب تالیفات" قرار دے کر اس کی عظمت ظاہر کی ہے،

[۶] عرفات العاشقین و عرصات العارفین، یہ فارسی شعراء کا عام تذکرہ ہے، اور یہی وہ تصنیف ہے جس نے تقی اوحدی کا نام زندہ کر دیا ہے، اور جس کی اہمیت کے پیش نظر راقم الحروف نے مصنف کے حالات جمع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

یہ تذکرہ عام طور پر عرفات اور عرفات العاشقین کے نام سے مشہور ہے، لیکن خود کتاب مذکور میں عنوان "عرفات و عرفات عاشقین و عرصات و عرصات عارفین" ہے، گویا اپنے زمانے کے رواج کے مطابق تقی نے بھی اپنے تذکرہ کا عنوان دوہرا رکھا اور لفظی رعایت بھی پیش نظر رکھی، یعنی عرصات کے ساتھ عرصات اور عرفات کے ساتھ عرفات لایا، گلدستہ میں تقی ہی کی دوسری کتاب

[۱] بلنڈ نے لکھا کہ غالباً یہ کتاب سلیمان شاہ صفوی کے نام پر لکھی گئی (جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ج ۹ ص ۱۲۵) ہمیں اس کے ماننے میں تامل ہے کیونکہ سلیمان اس کتاب کی تکمیل کے تقریباً ۶۴ برس بعد ۱۰۷۶ھ میں تخت نشین ہوا ہے،

کہ عرفان کے حوالے سے ایک جگہ[۱] "عرفات العارفین و عرصات العاشقین" اور دوسری جگہ[۲] بغیر حوالے کے "عرفات العارفین" آیا ہے، صحف ابراہیم[۳] میں بھی گلدستہ کی طرح "عرفات العارفین و عرصات العاشقین" ہے، اصل کتاب میں جو عنوان درج ہے اس میں اضافت بطرز فارسی یعنی کسرہ ہے، اور گلدستہ اور صحف ابراہیم میں بطرز عربی یعنی "ال" ہے، دوسرا فرق یہ ہے کہ اصل کتاب میں عاشقین مقدم ہے اور ان دونوں کتابوں میں موخر ہے، حدیقۃ الشعراء[۴] (تالیف عہد آصفی) کے مصنف نے اس تذکرہ سے استفادہ کیا ہے، مگر اس کا عنوان "عرفات الشعراء" درج کیا ہے،

سنہ تصنیف جب تقی اوحدی نے ۱۰۱۵ھ میں سفر ہند اختیار کیا تو مختلف شعراء کے کلام بھی جمع کرتا رہا، اور قیام گجرات یعنی ۱۰۲۱ھ تک پورے چھ سال اس کام میں منہمک رہا، چنانچہ "فردوس خیال اوحدی"[۵] کے عنوان سے جس کا سنہ تالیف بھی نکلتا ہے، ایک بڑی ضخیم بیاض تیار ہو گئی، تقی نے ایک ہمراہی حیدر ہمدانی کے مشورہ سے سارے مواد کو ترتیب دیا، اور جب تقی آگرہ پہنچا تو دربار جہانگیری کے ایک امیر کے حکم کے بموجب تمام مواد پھر سے مرتب ہوا، اور ہر شاعر کے کلام کے ساتھ اس کے حالات بھی شامل کیے، اس طرح تذکرہ عرفات مکمل ہوا،

تذکرہ مذکور کے خاتمے میں تقی نے لکھا ہے کہ ۱۰۲۲ھ میں اس کتاب کی تدوین آگرہ میں شروع ہوئی اور آگرہ ہی میں ۱۰۲۴ھ میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا، سال اختتام اس سے نکلتا ہے

"بدین سال این نوبی تمام شد"

[۱] ورق ۹۸ ب [۲] دیباچہ گلدستہ [۳] ص ۲۸۸ [۴] ص ۹۵ حاشیہ [۵] "فردوس خیال اوحدی" سے سنہ ۱۰۲۱ھ نکلتا ہے، مگر تقی اصفہان سے ۱۰۱۵ھ کے ساتویں مہینے میں چلتا ہے، کچھ دن بعد شیراز پہنچتا ہے، ابتدائے قیام شیراز اور اختتام قیام گجرات کے درمیان کی مدت چھ سال بتائی ہے جو کسی حال میں ۱۰۲۱ھ کے اختتام کے پہلے نہیں ہو سکتی، خود مؤلف کے دوسرے بیانات سے یہ سنہ ۱۰۲۲ھ کے بجائے ۱۰۲۱ھ نکلتا ہے، البتہ اگر اصفہان سے روانگی کا سنہ ۱۰۱۴ھ مان لیا جائے تو ساری تاریخیں درست ہو جائیں۔

اس سلسلے میں بلنڈ سے ایک بڑی چوک ہوگئی، اس نے بیاض مذکور کا تو پورا عنوان یعنی "فردوس خیال اوحدی" دیا اور یہ بھی لکھا کہ اس سے سنہ تالیف بھی نکل آتا ہے (جرنل (لندن) ص ۱۳۵) مگر حاشیہ میں صرف "فردوس خیال" سے اس کا سنہ ۹۹۱ھ نکالا، اس ذرا سی چوک نے اسپرنگر[1] اور عبد المقتدر[2] کے بیان کو تمسخر خیز بنا دیا ہے، دونوں لکھتے ہیں کہ "فردوس خیال" جو ۹۹۱ھ میں تیار ہوئی صرف شیراز سے قیام گجرات تک ۶ سال کے جمع کیے ہوئے کلام پر مشتمل ہے، اور دہ کیٹلاگ کے الفاظ یہ ہیں:

He compiled an anthology of Persian poetry which he called فردوس خیال (This is a achronogram for 991) and which contains the verses collected by him in 6 years from Shiraz to Gujrat.

بالکل اسی طرح کا بیان بانکی پور کیٹلاگ میں بھی ہے،

مگر اس غلطی کا کیا ٹھکانا کہ ۹۹۱ھ کی مرتب کی ہوئی بیاض ان اشعار پر مشتمل بتائی جائے جو ۱۰۱۵ھ سے ۱۰۲۱ھ تک جمع ہوئے، حالانکہ یہ تینوں تاریخیں دونوں کیٹلاگروں کے پیش نظر تھیں۔

گلدستہ[3] کے بیان سے ایسا خیال ہو سکتا ہے کہ خود جہانگیر کے حکم سے "عرفات" مرتب ہوئی مگر جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، اس کتاب کی تکمیل کے دوران میں[4] (یعنی ۱۰۲۲ھ سے ۱۰۲۴ھ تک

---

۱ ص ۹۹ حاشیہ ۲ ج ۸ ص ۷۷ ۳ دیباچۂ گلدستہ ۴ مرشد کے حالات میں صاحب عرفات لکھتا ہے "در اثنائے تحریر این مقالات بہ آگرہ آمدہ چندے روز او را دریافتم پس در اجمیر رفتہ او دوست جہانگیر واصل شد" اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان ایام میں جہانگیر آگرہ سے باہر اجمیر میں تھا،

جہانگیر آگرہ ہی میں نہ تھا، وہ ۲ شعبان ۱۰۲۲ھ کو اجمیر کے لیے روانہ ہوا، اور وہیں سے ۱۰۲۶ھ میں گجرات گیا اور ۲۲ رمضان ۱۰۲۷ھ کو وہاں سے آگرہ واپسی ہوئی، گویا تقی کے قیام کے درمیان بادشاہ کا قیام آگرہ صرف نام کو تھا، پھر عرفات کے بیان سے صاف طور پر نمایاں ہے کہ اس کی ترتیب میں دربار جہانگیری کے ایک امیر کا مشورہ شامل تھا۔

اس لیے عرفات کی تکمیل ۱۰۲۴ھ میں ہوئی، لیکن اس میں ترمیم و تنسیخ، اصلاح و اضافہ بہت عرصہ بعد تک ہوتا رہا، کم از کم ۱۰۲۷ھ تک کی اصلاح اس میں پائی جاتی ہے،

عرفات العاشقین ۲۸ عرصات میں منقسم ہے، ہر حرف تہجی کے لیے ایک عرصہ مقرر ہے، ہر عرصے میں تین غرفے ہیں جو بالترتیب شعرائے متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے حالات پر حاوی ہیں،

تذکرے کی اہمیت

چونکہ یہ تذکرہ اس درجہ کم یاب ہے کہ یورپ میں اس کا کوئی نسخہ نہیں پایا جاتا اس لیے اب تک کسی یورپی مصنف نے اس سے استفادہ نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس عہد کا تذکرہ ہے اس زمانے کے فارسی ادب کی تاریخ پر تاریکی کا بڑا گہرا پردہ پڑا ہے، بعض لوگوں نے اس عہد کے ادب پر محض اپنے قیاس کی بنا پر اظہار خیال کیا ہے، جو حقیقت سے دور معلوم ہوتا ہے اس لیے اس تذکرے کی دریافت اور اس کی اشاعت سے دسویں اور گیارہویں صدی ہجری کے فارسی ادب کے متعلق صحیح رائے قائم کی جا سکے گی، اسی زمانے کا دوسرا تذکرہ خلاصۃ الاشعار مولفہ تقی کاشی بھی قلمی ہونے کی وجہ سے خواص کی دسترس سے باہر ہے، اس لیے فارسی ادب کے مورخ اس سے بھی بے بہرہ رہے، اور پروفیسر براؤن تک ان دونوں میں سے کسی سے استفادہ نہ کر سکے، اس لیے انکی رائے کم از کم اس عہد کے بارے میں بالکل صائب قرار نہیں دی جا سکتی، اس اعتبار سے عرفات العاشقین اور خلاصۃ الاشعار فارسی ادب کے ایک بڑے خلا کو پر کریں گے۔

(۲) تقی اوحدی خود اعلیٰ درجے کا شاعر اور انشاء پرداز تھا، اس کی پوری زندگی علم و ادب کی

خدمت میں گزری، تیس ہزار سے زیادہ اشعار کہہ ڈالے اور کئی ہزار نثری صفحات یادگار چھوڑے،
ایسا فاضل جب کوئی تذکرہ لکھے گا، وہ جس قدر اہم اور کارآمد ہوگا وہ محتاج بیان نہیں،

(۳) اس مصنف کی زندگی ایران کے اہم مراکز یعنی شیراز، اصفہان، قزوین اور کاشان
میں بسر ہوئی، اس لیے اس زمانے کی علمی و ادبی زندگی کا جو خاکہ تقی نے کھینچا ہے، وہ نہایت
قابل قدر ہے،

(۴) مصنف کا تعلق ایران کے معزز خاندان سے تھا، صفوی دربار میں اس کی رسائی تھی،
اس اعتبار سے اس کے وسائل معلومات بہت وسیع تھے،

(۵) اس نے اپنے معاصرین میں سے بہتوں سے ملاقات کی اور اپنے حوالے سے ان کا ذکر
کیا ہے، اور تذکرہ میں جس قدر اپنے ذاتی حالات بیان کیے ہیں کم تذکرہ نویسوں نے بیان
کیے ہوں گے، اس کے بیشتر شاعروں کی زندگی کے واقعات اور ان کے سنین کے تعین میں بڑی
آسانی ہوتی ہے،

(۶) مصنف نے ہر بڑے واقعے کی تاریخ درج کرکے استفادہ کرنے والوں کے لیے
بڑی آسانیاں فراہم کردی ہیں،

(۷) اس تذکرے کی بدولت سیکڑوں گم نام شاعر زندہ ہوگئے، اور نہ جانے کتنے مشہور
شاعروں کا کلام نگاہ کے سامنے آجاتا ہے،

(۸) مصنف نے دسویں اور گیارھویں صدی کے بہت سے ادبی معرکے و مناظرے زیب
قرطاس کردیے ہیں جن کی بدولت اس عہد کی ادبی زندگی نمایاں ہوجاتی ہے، شاعروں کے تعلقات
پر جس صفائی کے ساتھ اس نے روشنی ڈالی ہے، کم مصنفین نے ڈالی ہوگی۔

(۹) تقی اوحدی نے متقدمین کے حالات لباب الالباب سے لیے ہیں، اس تذکرہ کی کمیابی کا

یہ عالم ہے کہ صرف اس کے تین ناقص نسخے پائے جاتے ہیں، پروفیسر براؤن کو صرف دو نسخوں کا علم تھا،
اور ان ہی دونوں نسخوں کی مدد سے جن میں ایک میں اکثر بیاض چھوٹی ہوئی ہے، اور دوسرا ناقص
الطرفین ہے، شائع کردیا ہے، ایک تیسرا نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ہے جس کا تعارف میں نے معارف
کے ذریعے سے کرادیا ہے، اس لیے جو لوگ لباب الالباب سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے لیے عرفات
العاشقین کا مطالعہ بہت مفید ہوگا، کیونکہ صاحب عرفات نے بڑی توجہ سے تذکرہ مذکور کا
استعمال کیا ہے،

مگر باوجود کمیابی کے اس تذکرہ کا حوالہ جس قدر ملتا ہے، اور تذکروں کا اتنا نہیں ملتا،
خود خلاصۃ الاشعار کے مقابلہ میں جو بعض اعتبار سے اس سے اہم ہے، متاخرین تذکرہ نویسوں
نے عرفات ہی پر زیادہ اعتماد کیا ہے، اور وہ تذکرہ نویس بھی جو اس مصنف کے بارے میں بہت
اچھی رائے نہیں رکھتے، وہ بھی بار بار اسی کا تذکرہ کرتے ہیں، مثلاً والہ داغستانی[1] نے عرفات کے
مزخرفات کی شکایت کے باوجود شاعروں کے حالات اسی کے حوالے سے لکھے ہیں، خان آرزو[2]
کی رائے ہے کہ

کتابے بایں جامعیت دیدہ نشدہ، اما بعضے جاہاش بعلت عدم نظر ثانی سقیم است

(۱۰) جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے یہ تذکرہ مصنف کی زندگی کا حاصل ہے، سنہ ۹۹۱ھ سے ۱۰۲۴ھ
تک کا طویل زمانہ اس کی ترتیب میں صرف ہوا، اس کے بعد ایک عرصہ تک اس پر نظر ثانی بھی ہوتی رہی
مگر باوجود ان خصائص کے یہ تذکرہ اسقام سے پاک نہیں ہے، اور نظر ثانی کے باوجود کہیں
کہیں غلط تاریخیں درج ہوگئی ہیں، خود اپنے ذاتی حالات میں بعض واقعات کے سنین کے تعین
میں غلطی ہوگئی ہے، اس کا سب سے بڑا سبب اس کی ضخامت[3] ہے، اتنے ضخیم تذکرہ میں چند چھوٹی چھوٹی

۱؎ ریاض الشعرا حالات تقی اوحدی ۲؎ مجمع النفائس و صحف ابراہیم ص ۲۸۸ ۳؎ اس میں تقریباً اسی ہزار بیت ہیں، ملاحظہ ہو
ریاض الشعرا (خطی لکھنؤ)، صحف ابراہیم (۲۸۸)، صبح گلشن ص ۸۸

غلطیاں باقی رہنا بعید از قیاس نہیں،

تذکرہ عرفات کے نسخے عرفات العاشقین کے مخطوطے مدت سے کمیاب تھے[1]، آزاد نے خزانۂ عامرہ میں لکھا ہے کہ اس کا ایک نسخہ ان کی نظر سے گزرا تھا جس میں حرف ص تا ی کے شعراء کا حال درج تھا، لیکن خزانۂ عامرہ کی تحریر کے وقت وہ نسخہ سامنے نہ تھا، خان آرزو نے مجمع النفائس میں اس کی کمیابی کا تذکرہ کیا ہے، ان کے پاس اس کا ایک ناقص نسخہ تھا، انڈیا آفس کے کتاب خانے میں جو نسخہ ہے، جس کا تفصیلی حال مسٹر بلند نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے کیٹلاگ (ج ۹ ص ۱۲۴) میں درج کیا ہے، وہ بھی ناقص ہے یعنی صرف حرف ق تک ہے، اودھ کے شاہی کتب خانے میں اس کا کوئی نسخہ موجود نہ تھا، اور نہ اس وقت یورپ کے کسی کتاب خانے میں موجود ہے، البتہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے پیش نظر اس کا ایک نسخہ تھا، اور انھوں نے بعض شاعروں کے حالات میں اس سے مدد بھی لی ہے، مگر فی الحال ہم اس کی صراحت سے قاصر ہیں۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ ایسے نایاب روزگار تذکرے کا ایک نہایت عمدہ نسخہ بانکی پور کے کتاب خانۂ مشرقیہ میں موجود ہے، جو دو جلدوں میں ہے، لیکن یہ جلدیں خود مصنف کی تقسیم کردہ نہیں ہیں، بلکہ محض آسانی کے لیے دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے، پہلی جلد میں ۴۲۰ ورق ہیں، اور دوسری میں ۳۹۰۔ پہلی جلد میں پہلا شاعر ابو الحسن رودکی اور آخری محمد طاہر موسوی ہے، دوسری میں پہلا شاعر محمد طاہر عطار اور آخری مرزا یوسف خان، شاعروں کے حالات حروف تہجی کے اعتبار سے ہیں،

یہ نسخہ اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ مصنف کی وفات کے دس سال کے اندر ہی یعنی ۱۴ جمادی سنہ ۱۰۵۱ھ میں میر صابر کے حکم سے لکھا گیا ہے، کاتب کا نام درج نہیں، لیکن شروع سے

۱؎ ملاحظہ ہو بانکی پور کیٹلاگ ج ۸، ص ۸

آخر تک ایک ہی قلم ہے، جو نہایت عمدہ نستعلیق ہے، کتاب کے شروع میں یہ تحریر ہے:

"بتاریخ بیست و ہفتم شہر ذی حجہ سنہ ۱۱۲۳ھ این کتاب مستطاب را در مستقر الملک صوبۂ اکبر آباد ہدیہ نمودہ شد حق سبحانہ توفیق مطالعہ دہاد"

اس کا سائز ۱۴ × ۸ ½ : ۹ ¾ × ۵ ہے، اور ہر صفحہ میں ۲۵ سطریں ہیں،

اس نسخے کے شروع میں ۳۱۸۶ شاعروں کی فہرست دی ہے، لیکن حرف ح کے عرصۂ دوم و سوم کے کل شعراء کے حالات درج نہیں ہیں اور ۱۳۴ شعرا ایسے ہیں جن کا نام تو فہرست میں درج ہے، مگر ان کے حالات متن میں نہیں ہیں، مگر اس مخطوطے میں کوئی نقص نمایاں نہیں ہے، اس سے بظاہر یہ قیاس ہوتا ہے کہ جس نسخے کی یہ نقل ہے وہی ناقص رہا ہوگا،

[۷] کعبۂ عرفان۔ عرفات کا انتخاب ہے، گلدستہ[1] میں کعبۂ عرفان کی یہ عبارت پائی جاتی ہے:

"در سنہ ۱۰۲۲ھ عرفات را در آگرہ ترتیب دادم در دو سال بہ اتمام رسید این نسخہ کہ کعبۂ عرفان است از عرفات در احمد آباد و گجرات سنہ ۱۰۳۶ھ منتخب شد"

مصنف کی یہ بہت مقبول تصنیف ہے، چنانچہ متعدد تذکرہ نویسوں نے اس سے استفادہ کیا ہے، ریاض الشعراء[2] میں ہے:

"تذکرہ مسمی بہ عرفات ...... تالیف نمودہ مشتمل بر ہشتاد ہزار بیت و باز از آن تذکرہ دیگر انتخاب کردہ است مسمی بہ کعبۂ عرفان کہ اگر بہ نظر نکتہ سنجان و دقیقہ یاب برسد باید مولف را از ان دری یابند، در حین تحریر این اوراق تذکرۂ مذکور در نظر این بے شعور بود"

کعبۂ عرفان جیسا کہ گلدستہ کی منقولۂ بالا عبارت سے ظاہر ہوتا ہے، احمد آباد گجرات میں سنہ ۱۰۳۶ھ میں مکمل ہوا،

۱؎ ورق ۹۹، گلدستہ انتخاب کعبۂ عرفان کا انتخاب ہے، اس کا مصنف عبد الوہاب عالمگیری ہے جس نے سنہ ۱۱۰۵ھ میں اسے مکمل کیا، ۲؎ نسخہ خطی لکھنؤ ذیل حالات تقی،

[۸] انتخاب کعبۂ عرفان ۔ خود مولف نے کعبۂ عرفان کا انتخاب کیا تھا، اور اس میں تین رکن قائم کیے تھے، رکن اول میں شعرائے متقدمین، رکن دوم میں شعرائے متوسطین اور رکن سوم میں شعرائے متاخرین کے حالات تھے، اور تینوں رکن بالترتیب خانی، منانی، ودانی کے نام سے موسوم تھے، گلدستہ کی حسب ذیل عبارت[۱] سے اس انتخاب کا پتہ چلتا ہے،

وبہ نستعین من کعبہ عرفان انتخاب عرفات العارفین تصنیف میر تقی الدین حسینی دقاقی بلیانی کہ بموجب حکم نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ تذکرۃ الشعرا بقلم آوردہ سہ رکن مرتب نمودہ، خانی، منانی، ودانی ہرسہ حالات متقدمین ومتوسطین ومتاخرین،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ انتخاب بحکم جہانگیر عمل میں آیا، لیکن یہ کچھ مستبعد معلوم ہوتا ہے کیونکہ ۱۰۳۶ھ کے بعد یہ انتخاب جب عمل میں آیا ہوگا، اس وقت جہانگیر کا بقید حیات ہونا مشتبہ ہے، اس نے ۲۰ صفر ۱۰۳۷ھ[۲] میں یعنی ۱۰۳۷ھ کے دوسرے مہینے میں آخرت کا سفر اختیار کیا ہے، اس کے علاوہ ہمارا مصنف ان ایام میں گجرات میں تھا، اور جہانگیر سیر کشمیر میں مصروف تھا، اور کشمیر سے واپسی میں موضع چکرہتی میں اس کا انتقال ہوگیا،

(د) تقی اوحدی نے بعض شاعروں کے دیوان بھی ترتیب دیے تھے، جن میں صرف وحشی کے دیوان کے متعلق یہ اطلاع[۳] ملتی ہے،

کلیات اورا بندہ نہ ہزار بیت جمع کردہ ام مبنی بر قصائد غیر ادمجادلت وترجیعات وترکیبات از مدائح واہاجی ومقطعات ورباعیات ومثنویات چوں ناظر ومنظور وخلد برین کہ تمام کردہ وفرہاد وشیرین کہ عالمگیر شدہ امانا تمام است ویک ہزار وپنجاہ بیت باشد۔

[۱] گلدستہ دیباچہ ص ۲ ورق ب [۲] توزک جہانگیری ج ۲ ص ۳۴۴ [۳] عرفات ورق ۷۸۹ آ

اسپرنگر نے کلیات تقی اوحدی کا جو نسخہ اودھ[۱] کے شاہی کتاب خانے میں دیکھا تھا، اس کے اجزا حسب ذیل تھے،

۱۔ دیباچہ مختصر در نثر				
۲۔ قصائد در مدح ائمہ	۵۹ صفحہ	۱۵ سطری	تقریباً	۸۸۵ اشعار
۳۔ غزلیات	۱۹۸ "	۱۴ "	"	۲۷۷۲ "
۴۔ رباعیات	۱۴۴ "	۱۰ "	"	۱۴۴۰ "
		میزان		۴۰۹۷ "

اسپرنگر ہی کی تصریح سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں بعض نظمیں سنہ ۹۹۱ھ کی ہیں، جب کہ وہ شیراز میں تھا، بعض اصفہان کے قیام یعنی سنہ ۱۰۱۲ھ کی، بعض قیام احمد آباد سنہ ۱۰۲۱ھ اور سنہ ۱۰۳۱ھ کی، اور بعض قیام آگرہ یعنی سنہ ۱۰۲۳ھ کی ہیں، گویا متذکرۂ بالا کلیات سنہ ۹۹۱ھ کے قبل سے ۱۰۳۱ھ تک کے اشعار پر مشتمل ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ جتنے دواوین وغیرہ کا ذکر گلدستہ میں ہے، ان میں سے کوئی بھی اتنے عہد کے کلام اور اتنے اصناف سخن پر حاوی نہ تھا، ممکن ہے کہ یہ کوئی منتخب کلیات ہو، جو اس کی زندگی ہی میں یا موت کے بعد کسی نے مرتب کیا ہو، ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ جن دواوین کا نام فہرست بالا میں درج ہے ان میں کوئی صراحۃً رباعیات کا دیوان نہیں ہے، حالانکہ اس نے رباعیات ضرور لکھی ہوں گی (اور کلیات نے تو اس قیاس کو حقیقت بنا ہی دیا ہے) ممکن ہے کہ دیوان آدمیت ہی رباعیات کا دیوان ہو،

تقی اوحدی کی تصنیفات کی اس طویل فہرست پر نظر ڈالنے سے اس کی فضیلت نمایاں ہوجاتی ہے کہ وہ ایک بڑا شاعر، ادیب اور مورخ تھا،

[۱] اودھ کیٹلاگ ص ۵۷۶

تقی اوحدی کی شاعری جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، تقی اوحدی نے تیس ہزار سے زیادہ اشعار کہے جس سے اس کی پرگوئی پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے، مگر اس کی غزلوں اور قصیدوں کے سارے دواوین اور مثنویات ہفتگانہ سب کی سب دستبرد زمانہ کی نذر ہو گئیں اور اس کے ذخیرۂ اشعار میں سے جو اشعار ہم تک پہنچے ہیں، ان کی تعداد ... ابھی نہیں ہے، اور چند رباعیوں کے علاوہ وہ سب کے سب غزل کے ہیں، اس لیے صرف اتنے اشعار کی بنا پر ہم اس کی شاعری کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے، لیکن خود تقی نے اپنی شاعری کے متعلق جا بجا اظہار خیال کیا ہے، اس روشنی میں ہم اس کے موجودہ اشعار کا تجزیہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

وحشی یزدی[1] کے ضمن میں لکھتا ہے کہ اوائل عمر میں وہ وحشی کے طرز کا مقلد تھا، اور وحشی وہ شاعر ہے جس نے محتشم کاشی کے مقبول عام طرز کو منسوخ کر دیا تھا، مولانا شبلی[2] نہ وحشی کو صاحب طرز مانتے ہیں اور نہ محتشم کے مخصوص طرز کے مقبول عام ہونے کے قائل ہیں، مگر فی الحال ہم اس بیان کی تفصیل سے قطع نظر کرتے ہیں، خواہ وحشی کا کوئی مخصوص طرز رہا ہو یا نہ رہا ہو، مگر یہ واقعہ ہے کہ ہر بڑے شاعر کا اپنا ایک مخصوص طرز ہوتا ہے، اور اسی طرز کی بنا پر وہ دوسرے شاعروں سے ممتاز ہوتا ہے، یہی حال وحشی کا تھا، اس کے ہاں وقوع گوئی کے اشعار کی کثرت ہے، اور بعض ناقدین کا خیال ہے کہ وہ رند و اوباش تھا، اس لیے اس کی وقوع گوئی اعتدال سے بڑھ گئی تھی، اسی وقوع گوئی کی بنا پر وہ اور شاعروں سے الگ ہے، مگر اس کے ساتھ ہی معشوقانہ ناز و ادا کی جو جو کیفیات اس کے یہاں ملتی ہیں، اس سے بڑے بڑے شعرا کے دیوان خالی ہیں، ذیل کی چند مثالوں[3] سے اس کی وضاحت ہوگی:

مثلاً معشوق کی دلربایانہ کرشموں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ عاشق کی طرف متوجہ

---

[1] عرفات ورق ۸۰۹، [2] شعر العجم ج ۵ ص ۲۰، [3] یہ مثالیں شعر العجم ج ۵ سے لی گئی ہیں۔

ہونا چاہتا ہے، اس لیے اب زبانی عرض حال کی ضرورت باقی نہیں، اس کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے:

چہ لطفہاست کہ دریں شیوۂ نہانی نیست | عنایتے کہ تو داری بہ من بیانی نیست
کرشمہ گرم سوال است لب مکن رنجہ | کہ احتیاج بہ پرسیدن زبانی نیست

ایک غزل مسلسل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، جن میں معشوق کی بہار حسن کی خزاں، اسکی بربادی و خلوت گزینی، شعلۂ عشق کی افسردگی اور گذشتہ زندگی کے فائدہ نہ اٹھانے پر تاسف کا اظہار ہے،

انجام حسن او شدہ پایان عشق من ہم | رفت آں نوائے بلبل، بے برگ شد چمن ہم
کرد آں جہاں جمالے در کنج خانہ ضائع | بر عشق ما ستم کرد بر حسن خویشتن ہم
بد مستی غرورش ہنگامہ گرم نگذاشت | افسردہ کرد صحبت برہم زد انجمن ہم
آں بت کہ بود افتاد از طاق کعبۂ دل | وز کفر شد پشیماں آں کافر کہن ہم

معشوق لطف و کرم کی طرف مائل ہے، مگر عاشق کو یہ ڈر لگا ہے کہ کہیں مے التفات کا ساغر جلد نہ چھلک جائے، اس کیفیت کو کس شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے:

شراب لطف بہ دور جام می ریزی و می ترسم | کہ زود آخر شود ایں بادہ و من در خمار افتم

معشوق کی شہسواری کی کیفیت ملاحظہ ہو،

گرد سر تو گردم و آں رخش بر اندنت | واں دست و تازیانہ و مرکب جہاندنت
شہرے بہ ترکتاز دہد بلکہ عالمے | ترکانہ بر نشستن و ہر سو دوانندنت
طرز نگاہ نازم و جنبیدن مژہ | واں دامن کرشمہ بہ مردم فشاندنت

واسوخت کی ایجاد کا سہرا وحشی کے سر باندھا جاتا ہے، ایک واسوخت کے تین شعر ملاحظہ ہوں:

جستم از دام بلائے دگر فتاد دگر ۔۔۔ من نہ آنم کہ فریب تو خورم بار دگر

شد طبیبے من بیمار مسیحا نفسے ۔۔۔ تو برو بہر علاج دل بیمار دگر

گو مکن غمزہ او سعی بہ دل جوئی من ۔۔۔ زاں کہ دادیم دل خویش بدلدار دگر

اس طرز کی دلکشی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، یہی وجہ ہے کہ اوائل عمر ہی میں جب جذبات بہت تیز تھے، ہمارا شاعر وحشی کا تبع ہو جاتا ہے، مگر اسے یہ جلد محسوس ہو جاتا ہے کہ یہ طرز شہرت دوام کا ضامن نہیں ہو سکتا، اس لیے رفتہ رفتہ وہ بابا فغانی کی تقلید کرتا ہے، اور اس کی شاعری بابا کا رنگ اختیار کر لیتی ہے، عرفی کے حالات[1] کے ضمن میں لکھتا ہے کہ اس کے یہاں شعرا کی محفلیں جمتی تھیں، ان میں فغانی کی غزلوں کے جواب لکھے جاتے، چنانچہ خود مصنف بھی ان محفلوں میں شریک ہوتا تھا،

اسمیں شبہ نہیں کہ وحشی بھی اصلاً فغانی ہی کے طرز کا تبع تھا لیکن اس نے تغزل میں زیادہ کمال پیدا کیا، اور یہ عنصر اسکی شاعری میں اتنا شامل ہو گیا کہ اسکا امتیازی وصف ہو گیا، فغانی کا اصل میدان خیال ہائے نازک و معانی بلند ہیں، اسکے یہاں جدت مضامین کے ساتھ طرز ادا میں بھی ندرت ہوتی ہے، اور سادہ خیال میں بھی کوئی نہ کوئی معقول نزاکت پائی جاتی ہے، تشبیہ و استعارے بھی جدت آفرینی سے خالی نہیں ہوتے، اس طرز کا موجد اگرچہ فغانی ہے، لیکن اس کی تکمیل نظیری، عرفی اور ظہوری وغیرہ کے ہاتھوں ہوئی، ذیل کی مثالوں سے اس کی وضاحت ہوگی،

در ماندۂ صلاح و فسادیم الحذر ۔۔۔ زیں رسمہا کہ مردم عاقل نہادہ اند

اس شعر میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ حکما، و فلاسفہ نے خیر و شر اور صلاح و فساد کے جو اصول قائم کیے ہیں، ان میں اس درجہ اختلاف ہے کہ عام لوگ مشکل میں پڑ جاتے ہیں اور

[1] عرفات ورق ۵۰۲ [2] تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو شعر العجم ج ۳ ص ۲۵-۱۲۶ اور ج ۵ ص ۵۹-۶۴

چونکہ دونوں رائیں باہم مخالف و متضاد ہیں، اس لیے کوئی بھی تسلیم نہیں کی جا سکتی، یہ شعر ہر شعبۂ حیات پر پوری طرح صادق آتا ہے، عرفی نے اس خیال میں یہ ترمیم کی ہے کہ وہ صلاح و فساد کے بجائے کفر و دیں کا لفظ استعمال کرتا ہے، اور دونوں کو فتنہ گر کہتا ہے اور اس کے الفاظ غزل کے مزاج سے زیادہ آشنا ہیں،

کفر و دیں را ببر از یاد کہ ایں فتنہ گراں ۔۔۔ در بد آموزی ما مصلحت اندیش خود اند

فغانی کہتا ہے:

اے کہ می گوئی چرا جامے بہ جانے می خری ۔۔۔ ایں سخن با ساقی ما گو کہ ارزاں کردہ است

طرز ادا کا لطف ملاحظہ ہو کہ شراب کا شیدائی جان کے عوض ایک جام خریدتا ہے، معترض اعتراض کرتا ہے کہ بھلا شراب بھی جان کے عوض خریدنے کی کوئی چیز ہے، مے پرست لطیف جواب دیتا ہے کہ یہ اعتراض تو مے فروش پر کرنا چاہیے کہ اس نے اتنی ارزاں کر دی ہے،

ساقی مدام بادہ بہ اندازہ می دہد ۔۔۔ ایں بیخودی گناہ دل زود مست ماست

شاعر کی بدمستی کی وجہ سے ساقی پر اعتراض ہوا کہ اس نے اندازہ سے زیادہ شراب پلادی، مے پرست جواب دیتا ہے کہ اس میں ساقی کا قصور نہیں، بلکہ قصور میرے دل کا ہے جو بہت جلد مست ہو جاتا ہے،

اوحدی کے جو اشعار ہمارے پیش نظر ہیں ان میں عشق کے جذبات و معاملات بڑے نازک و لطیف انداز میں بیان ہوئے ہیں، کبھی معشوق کی کج ادائیوں کا شکوہ ہے، کبھی ظلم و ستم کا، کبھی اخفائے راز کی کوشش کا ذکر ہے، کبھی اپنی بدبختی پر زار نالی ہے، اور جو بیان بھی ہے نہایت کامیابی کے ساتھ ہے، اور ان اشعار میں کہیں کہیں بڑی نازک معانی آفرینی اور جدت طرازی ہے، جو فغانی کی تقلید کا اثر ہے، اس کی وضاحت حسب ذیل مثالوں سے ہوگی:[1]

[1] یہ مثالیں صرف دو تذکرے یعنی ریاض الشعرا (خطی لکھنؤ) اور صحف ابراہیم سے منقول ہیں،

اے قاصد ایں تبسم پیش از کلام تو — از التفات یار خبر می دہد مرا

یعنی کچھ کہنے کے قبل ہی قاصد کی مسکراہٹ التفات یار کی خبر دیتی ہے،

منم کہ عشق فروزندہ از چراغ منست — فتیلہ ایست محبت کہ ہر داغِ منست

مزن بہ شمع دلم آستین محرومی — کہ دودمان وفا روشن از چراغ منست

جب عشق کی ساری ہنگامہ آرائی عاشق ہی کے دم سے ہے، اور وفا کا چراغ اسی کے سوز دل سے روشن ہے تو اس کو محروم نہ کرنا چاہیے،

تا از بختم تیرگی می رفت چشم شد سفید — ایں سیاہی از سر داغ من آساں برنخاست

میری قسمت کی تیرگی اس وقت دور ہوئی جب میری آنکھ بھی سفید ہو گئی یعنی آسانی سے نہیں گئی،

چناں بگرفتہ گردونم کہ گوئی — عس در خانۂ خویشم گرفتہ است

یعنی مجھکو آسمان کی گردش نے اس طرح گھیر لیا ہے جیسے پولیس نے اپنے گھر میں گھیر لیا ہے،

بیستون جان شیریں خوش تلخی می کنم — در محبت خسروی گر نیست فرہادیم ہست

عاشق کی جاں کنی فرہاد کی کوہ کنی سے کم نہیں، اس اعتبار سے اگرچہ وہ خسرو اقلیم محبت نہ ہو سکا لیکن کم از کم اسے کوہ کن کی حیثیت تو حاصل ہو گئی، اس شعر میں لفظی رعایت کے باوجود دلآویزی ہے۔

می خواست سایہ بر سر بخت من افگند — ز آسیب سنگ حادثہ بال ہما شکست

شد خنجر بخت شکستہ چو بہ پیکرم رسید — آرے ز بخت بد بگلو آب بشکند

دونوں شعروں میں بدبختی کا موثر بیان ہے، دوسرے شعر میں تشبیہ نے جان ڈال دی ہے،

آمد بکعبۂ دل ما چوں خلیل عشق — ہر آرزو کہ دید بجاے صنم شکست

دل کو کعبہ اور محبوب کو خلیل سے تشبیہ دی ہے کہ اس کے خیال نے آرزو کے ہر بت کو دل سے نکال دیا،

عالم درد خدایا چو کرامت کردی — طاقتے نیز باندازۂ آں می بایست

درد کی دولت عطیۂ خداوندی ہے اسلیئے اس کے برداشت کے لیے طاقت بھی عطا کرنا چاہیے بڑا عمدہ خیال ہے،

ہمیں تاثیر دیدم در محبت — کہ تاثیر از دعاہاے سحر رفت

عاشق کی دعا تنہا بے اثر ہے کہ دعاے سحری جس کی تاثیر مسلم ہے، وہ بھی عاشق کے منہ سے نکل کر بے اثر رہ جاتی ہے،

بہ یک امید کہ حاصل شد از تبسم دوست — ہزار خواہشم از سینہ سر برآورد است

معشوق کا ادنیٰ تبسم عاشق کے دل میں ہزاروں تمنائیں پیدا کر دیتا ہے،

غم عشق است مگر دہر کہ پایانش نیست — درد ہجر است مگر دہر کہ درمانش نیست

غم عشق اور درد ہجر کی بے درمانی اور طوالت کی اچھی تصویر ہے،

غلط کردم رخ طاقت سیہ باد — کہ پیشت کردم اظہار محبت

اس شعر میں بڑی سادگی اور بے ساختگی ہے،

بے تو بر من شب فراق نخست — چوں شب اولیں گور گذشت

اس شعر میں شب فراق کی سختی کی بڑی موثر تصویر کھینچی گئی ہے،

بہ وفاے کہ ترا نیست چناں دل بستم — کہ ز تیغ اجلم از تو جدا نتواں کرد

عاشق و معشوق کا رشتۂ محبت تیغِ اجل سے بھی نہیں کٹ سکتا، "بہ وفاے کہ ترا نیست" کے ٹکڑے نے لطف کو دوبالا کر دیا ہے،

بذوق یک نگہ صد بار مردم — محبت بیش ازیں امکاں ندارد

محبت میں اس سے زیادہ اور کیا امکان ہے کہ محبوب کی ایک نگاہ کی امید میں وہ سو جانیں قربان کر دیتا ہے۔

چو دوستت ز اہل محبت نثار جاں طلبد — خضر چہ ننگ کہ از عمر جاودان نبرد

خضر کی حیات جاوداں اس لیے باعث ننگ ہے کہ وہ دوست کی طلب پر اس کو نثار نہیں کر سکتا،
اسی سے ملتا ہوا یہ خیال ہے

در رضائے دوست مردن بہ کہ عمر جاوداں — زندگی را اے خضر تا کے وبالِ خود کنی

وہ زندگی جو رضائے دوست میں نہ قربان ہو سکے، وبال ہے، اور رضائے دوست کے مقابلہ میں
عمر جاودان کی کوئی حقیقت نہیں، اس عاشق سے جو ہجر دوست میں زندہ رہتا ہے، وہ ہندو عورت
ہزار درجہ بہتر ہے جو راہ وفا میں جل کر جان دیدیتی ہے۔

ازاں عاشق کہ ماند زندہ در ہجراں بود بہتر — زنِ ہندو کہ خود را در وفا مردانہ می سوزد

"مردانہ" میں باوجود رعایت لفظی کے ایک حسن ہے،

خضر دارد بہ عمر جاودانی فخر ما از ننگ — نیالائیم از لوث بقا دامان ہمت را

خضر کو عمر جاوداں پر فخر ہے لیکن میرے لیے باعث ننگ ہے، اور میں اپنے دامن محبت کو بقائے دائمی
کے داغ سے آلودہ نہیں کر سکتا،

بسکہ محرومی دیدار تو بردیم بخاک — ناامیدی چو گل از تربت ما می روید
آں چناں از وصل محرومم کہ گر تیغم زنی — ناامیدی از رگ جانم بجائے خوں جہد

دونوں شعر حسرت و نامرادی کا مرقع ہیں،

فریاد کہ غم ہائے ز اندازہ بروں است — ترسم ہمہ در سینہ بہ یک بار نگنجد

غم کی زیادتی کا اچھوتا بیان ہے اور طرز ادا کی دلکشی نے شعر میں بڑا لطف پیدا کر دیا ہے،

از وے یک پرسشے دیدم کہ گر صد بار برگردم — امید آں عیادت بازم اندر بستر اندازد

ایک مرتبہ معشوق کی عیادت کر آئندہ عیادت کی امید میں عاشق ہمیشہ بیمار رہتا ہے۔

بہ نگاہے فروختم خود را — چہ کنم بیشتر نمی ارزم

عاشق کی قیمت صرف ایک نگاہ ہے، اس کی ہیچ میرزی کا اس سے بہتر ثبوت نہیں ہو سکتا،

با یار بہ من گر بود امید [اجابت] — خواہم ز خدا سینۂ افگار و دگر ہیچ
در حشر چو پرسند کہ سرمایہ چہ داری — گویم کہ غم یار و غم یار و دگر ہیچ

عاشق کی انتہائی تمنا غم یار و سینہ افگار ہے، اس لیے وہ دنیا میں سینہ افگار کی دعا کرتا ہے
اور حشر میں بھی غم یار کی متاع پیش کرے گا، دونوں شعر نہایت لطیف جذبات کے حامل ہیں،
جو بڑے دلنشین انداز میں ادا ہوئے ہیں۔

رباعیات کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

اے حاصل عمر آرزومندی تو — آزاد تہا و تا ابد بندی تو
گر ما روش بندگی از کف دادیم — آخر بکجا رفت خداوندی تو

اے خدا تیری آرزو حاصل زندگی ہے اور کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی آزاد طبع ہو تیرے خیال
سے غافل نہیں رہ سکتا، اے خدا اگر ہم بندگی کے طریقے چھوڑ بیٹھے تو یہ تو کوئی بڑی بات ہوئی، آخر
تیری خداوندی کا کیا تقاضا ہے۔

بر نالش من دل اثر می سوزد — بر سوز دلم جان سقر می سوزد
در شعلہ رشک آفتاب تو خورشید — تا روز قیامتش جگر می سوزد

میری زار نالی سے اثر کا دل جل اٹھتا ہے، میرے دل کی سوزش پر دوزخ کو بھی رحم آجاتا ہے،
خورشید تیرے آفتاب کے رشک کی آگ میں تا قیامت جلتا رہے گا۔

یادم ز لبت چو در کفن می آید — جاں رقص کناں سوئے بدن می آید
تا شعلۂ حسرت فتادست بدل — بوئے جگر از نالۂ من می آید

جب تیرے لبوں کی یاد قبر میں آتی ہے تو جان رقص کناں بدن میں آجاتی ہے اجب دل میں حسرت
و یاس کا شعلہ بھڑکا ہے، میرے نالے سے بوے جگر آرہی ہے یعنی جگر کباب ہوگیا ہے۔

تیغت بخود ز قتل من می بالد — جانم ز شوق در بدن می بالد
تا روز جزا بہ خواہش زخم دگر — بسمل شدہ تو در کفن می بالد

اے دوست جس طرح تیری تلوار میرے قتل کے خیال سے اپنے آپے میں نہیں سماتی، اس طرح
میری خوشی کا یہ عالم ہے کہ جان بدن میں بالیدہ ہو رہی ہے، تو نے مجھے گھائل تو کر دیا ہے مگر میں
روز جزا تک زخم دگر کی تمنا کرتا رہوں گا، کیونکہ تیرا بسمل کفن میں بھی بالیدہ ہوتا ہے۔

یہ چند اشعار مختلف دواوین سے منتخب کیے گئے ہیں، انتخاب کرنے والے والہ داغستانی
صاحب ریاض الشعراء اور علی ابراہیم خاں خلیل صاحب صحف ابراہیم جیسے ادیب ہیں، گو
دو سو سال گزرنے کے بعد ذوق میں بڑا فرق ہوگیا ہے، مگر ان اشعار کے لطیف و نازک اور پرتر
ہونے میں کلام نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اشعار کی بنا پر تقی اوحدی کا شمار عہد اکبری و
جہانگیری کے درجہ اول کے شعرا میں نہیں کیا جا سکتا، اور عرفی، نظیری، طالب آملی، کلیم،
صائب وغیرہ اس سے بدرجہا بلند ہیں،

ان اشعار سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کا رنگ علی العموم فغانی سے مشابہ ہے، مگر زیادہ
گہرا نہیں ہے، اور ان میں اوحدی کی زیادہ توجہ معانی آفرینی و تخیل کی بلندی پر نہیں ہے
بلکہ اس نے عشق و عاشقی کے لطیف و نازک جذبات و معاملات کی ترجمانی دلنشین انداز میں
کردی ہے، اس لیے ان میں کافی سوز و گداز ہے، اور یہ سوز وحشی کے اتباع کا نتیجہ ہے، مگر
اس میں وحشی کی وقوع گوئی کا فقدان نظر آتا ہے،

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان کے مغل بادشاہوں کا نظام عدل

(۳)

ان کے مقدمے کی
مزلی اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کا ذکر پہلے آچکا ہے، ان کے مقدمے کی
سماعت جس طرح ہوئی اس سے مغلیہ سلطنت کی عدالتی کارروائی کے نظام کی تفصیل معلوم
ہوتی ہے، ان فرنگیوں کی تعداد چار تھی، وہ بحری قزاق سمجھے گئے، اسلیے حراست میں لے لیے گئے تھے، مدنا پور کے کوتوال کی
عدالت میں چھ فوجیوں کی نگرانی میں لائے گئے اور عدالت میں جیسے ہی داخل ہوئے، فوجیوں کے نگران اعلیٰ
نے ان کو اپنا اپنا سر جھکا کر کوتوال کی تعظیم بجا لانے کا اشارہ کیا، پھر اسی نگران اعلیٰ نے خود
بھی جھک کر تعظیم و تکریم کے مراسم ادا کیے اور آگے بڑھ کر کوتوال کے سامنے مدناپور کے
شقدار کا معروضہ پیش کیا، فرنگی قیدی اس کے پیچھے کھڑے رہے، کوتوال نے معروضہ پر
نظر ڈالی تو ملزموں کو پیش کرنے کا حکم دیا، اور جب وہ سامنے آئے تو کوتوال نے شقدار کا
معروضہ اپنے ایک ماتحت سے بلند آواز میں پڑھوایا، تاکہ ملزمین اپنے خلاف الزامات سن لیں،
شقدار نے ان پر یہ جھوٹے الزامات عائد کیے تھے کہ وہ دریا کے کنارے قزاقی کرتے ہوئے
پکڑے گئے، کوتوال نے ملزموں کو صفائی پیش کرنے کا حکم دیا، ان میں سے ایک فرنگی

ہندوستانی جانتا تھا، اس نے اصلی واقعہ بیان کیا، اور شقہ دار کی بدسلوکی کی بھی شکایت کی، کوتوال نے ان کے بیانات غور سے سنے، ان کے ساتھ پورا پورا انصاف کرنے کا وعدہ کیا، اور ان کو بیٹھ جانے کی اجازت دی، اس کے بعد فوجیوں کے نگران اعلیٰ کو ایک تحریر دی گئی اور وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ واپس چلا گیا، تحریر ملزموں کے عدالت میں حاضر ہو جانے کی گویا رسید تھی، ان کے جانے کے بعد ملزموں کی ہتھکڑیاں کھول دی گئیں، ان سے پوچھا گیا کہ شہر میں ان کا کوئی واقف کار ہے، انھوں نے نفی میں جواب دیا، کوتوال نے شہر کے تاجروں کو بلوا بھیجا، ان میں سے ایک نے بتایا کہ منریق بنجا کے پادری کا دوست ہے، تاجر کی مداخلت سے مقدمہ کی سماعت ملتوی کر دی گئی تو منریق نے بنجا کے پادری کو ایک خط لکھا، موخر الذکر نے اس کی دوستی کی تصدیق کی، تاجر مذکور نے پادری کا تعارفی خط کوتوال کے سامنے پیش کیا، اور منریق کے ساتھیوں کی ضمانت لی، اس کے بعد وہ رہا کر دیے گئے، چبوترہ یعنی عدالت کے دو حاکم تاجر کے ساتھ قید خانے گئے اور فرنگی ملزموں کو رہا کیا،

قید خانوں کی دو قسمیں تھیں، اول و دوم، اول درجہ کے قید خانوں میں شاہی خاندان کے افراد یا امرا محبوس کیے جاتے، دوسرے درجہ کے جیلخانوں میں عام مجرم رکھے جاتے، شاہی خاندان کے افراد اور امرا کیلیے جیلخانے عموماً ملک کے مختلف حصوں کے قلعے ہوتے، کبھی کبھی ان قلعوں میں عام مجرم بھی قید کر دیے جاتے لیکن ان کیلیے کمرے علحدہ ہوتے، یہ مخصوص قلعے گوالیار، رنتھنبور، رہتاس، بھکر، جنیر اور بیانہ کے تھے، کبھی صوبہ کے دار السلطنت کے قید خانے میں بھی بڑے بڑے عہدیدار قید کر دیے جاتے، مثلاً جب شاہ ابو المعالی نے غداری کی اور وہ گرفتار کر لیا گیا تو اکبر نے اس کی جان تو بخش دی، لیکن لاہور میں کوتوال کی نگرانی میں اس کو محبوس کر دیا، اور جب اسکی خبر کابل کے صوبہ دار منعم خاں کو ملی تو ابو المعالی کے بھائی کہمرد کے جاگیر دار محمد ہاشم کو مقامی جیل خانے میں قید کر دیا،

دار السلطنت اور دوسرے شہروں کے مرکزی جیلوں اور قلعوں کے علاوہ سرکار اور پرگنہ کے صدر مقامات میں بھی جیل ہوتے تھے جن کے معائنہ کے لیے کبھی کبھی بنفس نفیس خود بادشاہ چلا جاتا تھا، اور مراحم خسروانہ سے بعض قیدیوں کو رہا کر دینے کا حکم دیتا تھا، صوبہ کے صوبہ دار اور قاضی بھی وقتاً فوقتاً معائنہ کے لیے جایا کرتے تھے، ایسے چور، ڈاکو اور قاتل جن سے امن عامہ میں خلل پیدا ہونے کا احتمال رہتا تھا پکڑ کر جیل میں بند کر دیے جاتے تھے۔

ضمانت

ملزموں کو ضمانت پر رہا کر دینے کا بھی طریقہ جاری تھا، لاہور کے صوبہ دار محمد امین خاں نے مشہور فرنگی سیاح منوچی کو جب چوری کے الزام میں قید کر دیا اور امین خاں کے جانشین فدائی خاں نے اس کی رہائی کا حکم دیا تو کوتوال نے قانوناً منوچی کی ضمانت لیکر اسکو رہا کر دیا،

جیل کی زندگی

جب منریق اور اس کے ہمراہی گرفتار ہوئے تو ایک تاجر کی وساطت سے یہ درخواست کی کہ وہ عام قیدیوں کے ساتھ جیل میں نہ رکھے جائیں لیکن قانوناً ایسا ممکن نہ ہو سکا، اس لیے تاجر جیل کے نگراں سے ملتا رہا، اور ان فرنگی قیدیوں کے لیے اس نے زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کیں، ان پر قزاقی کا الزام تھا، اس لیے قانون کے مطابق عام قیدیوں کی طرح ان کے ہاتھ باندھ دیے گئے تھے اور گلے میں آہنی طوق ڈالدیا گیا تھا، تاجر کی سفارش سے ان کے ہاتھ کھول دیے گئے، اور طوق اتار لیا گیا، ان کے سونے کے لیے چارپائیاں بھی فراہم کر دی گئیں، اور تاجر کے یہاں سے کھانا منگوانے کی بھی اجازت دیدی گئی، ان کو ڈاکٹر کی ضرورت ہوئی تو وہ بھی بلوا دیا گیا جس نے ان کے زخم کا علاج بڑی ہوشیاری سے کیا، تاجر ان سے ملنے کے لیے روزانہ آتا تھا، اور ان کے آرام و آسائش کا پورا سامان مہیا کرتا رہتا تھا،

پولیس کا نظام

عدل کے سلسلہ میں پولیس کے عہدیدار پورے طور سے معاون ہوتے تھے،

پولیس کے نظام میں کوتوال کا عہدہ بہت اہم تھا جو محتسب کے بھی فرائض انجام دیتا تھا، جس
علاقہ میں چوری یا ڈکیتی ہوتی، تو اس علاقہ کے کوتوال اور فوجدار ذمہ دار ٹھہرائے جاتے
امن عامہ کے تحفظ اور مذہبی احتساب دونوں کی ذمہ داری ان ہی کے سپرد ہوتی تھی
سرکار میں پولیس کا نظام دو حصوں میں تقسیم تھا، فوجدار دیہی علاقوں کا نگران ہوتا تھا
اور کوتوال شہری علاقوں کی نگرانی کرتا تھا، پرگنہ میں ان دونوں کے معاون شقہ دار
عامل تھے، پرگنے بھی چھوٹے چھوٹے علاقوں میں تقسیم ہوتے تھے، جن میں کچھ گاؤں ایک تھانیدار کے ذمے ہوتے تھے، ایسے علاقوں
میں جہاں خطرناک قسم کے ڈاکو، رہزن اور چور ہوتے تھے مخصوص فوجدار متعین کیے جاتے
تھے، ان کے ماتحت کچھ لشکری اور کچھ عہدیدار بھی ہوتے تھے، آگرہ اور دہلی کی نگرانی خاص
طور پر کی جاتی تھی، متھرا، جہابن اور جالیسر کے فوجدار داؤد خاں قریشی کے ماتحت جو اس شاہراہ
کا محافظ تھا، دو ہزار سوار رہا کرتے تھے۔

امن اور حکومت کے استحکام کے زمانے میں ملک کی عام حالت پولیس کے نظام کی
وجہ سے بڑی اطمینان بخش تھی، اس عہد میں جتنے فرنگی سیاح بھی آئے سب نے ملک کے امن
و امان، خوشحالی، ضروریات بلکہ تعیشات زندگی کی فراوانی کی بڑی تعریف کی ہے، سڑکوں اور
شاہراہوں پر کسی قسم کا خطرہ نہ تھا، اور تجارتی سامان بڑی آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ
منتقل ہوتا تھا، دور دراز مقامات کی تجارت دریا یا لمبی سڑکوں کے ذریعہ ہوتی تھی، اور
راستہ میں جگہ جگہ تاجروں کے قیام کے لیے سرائیں اور منزلیں بنی ہوتی تھیں، جن میں ان کے
آرام و آسایش کی تمام چیزیں مہیا رہتی تھیں، ان سہولتوں کی وجہ سے تاجروں کے قافلے
برابر آتے جاتے رہتے اور تجارت کو فروغ ہوتا رہتا تھا، سرائے کے کارندے جس محنت
اور مستعدی سے مسافروں کی خدمت کرتے تھے، منریق نے اس کی بڑی تعریف کی ہے

اس کو اس لیے اور بھی تعجب تھا کہ ..... یورپ میں ایسا اخلاق کسی سرائے میں نظر نہیں
آیا تھا، وہ یہاں کی خوشحالی پر بھی بہت متعجب تھا کہ یہاں کے لوگ اپنے گھوڑوں اور
مویشیوں کو گھی، شکر اور مونگ کھلاتے ہیں، اس نے کچھ لوگوں کے کتوں کو روئی دار
کوٹ بھی پہنے دیکھا تھا، گجرات میں گائے اور بچھڑے کے جسم پر بھی اسی قسم کا لباس ہوتا تھا،
آگرہ سے لاہور کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے منریق نے لکھا ہے کہ راستے میں جا بجا سرائے کی
بڑی بڑی عمارتیں تھیں، اور تجارتی قافلے اس کثرت سے آتے جاتے رہتے تھے کہ سرائے میں
قیام کے لیے مشکل سے جگہ ملتی تھی، عام اشیا کی قیمتیں بہت کم تھیں، اور وہ فراوانی سے ملتی
تھیں، سڑکوں اور بازاروں میں بڑی صفائی نظر آتی تھی، ہر جگہ امن تھا، مسافر اور راہ گیر اپنی
چیزیں جہاں چاہتے کسی خطرہ کے بغیر رکھ دیتے، رات کو پہرہ کا خاطر خواہ انتظام رہتا تھا، جب
کوئی چور یا مجرم پکڑ جاتا تو اسی وقت جرم کی نوعیت کے مطابق اس کی سزا کر دی جاتی،
اس سے پولیس کی کارکردگی کا اندازہ ہوتا ہے، یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس زمانہ میں چوری
اور رہزنی ہوتی ہی نہیں تھی، کیونکہ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے، اس میں جنگلوں، پہاڑوں
اور دروں کی کمی نہیں، ان میں چور، مجرم، رہزن اور ڈاکو آسانی سے پناہ لے سکتے ہیں،
اور اس عہد میں بھی ایسی جگہوں پر چوری، رہزنی اور غارتگری ہوتی رہی ہوگی، اور ایسے
علاقے راہ گیروں کے لیے خطرناک ہوتے ہوں گے، جیسا کہ آجکل بھی ہیں، مگر جس کثرت اور
سہولت سے تجارتی کارواں آتے جاتے رہتے تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پولیس کا
انتظام خاطر خواہ تھا، اگر کہیں چوری ہوتی تھی تو حکومت اس کی ذمہ دار ہوتی تھی، اور فوجدار
اور کوتوال کو نقصان پورا کرنا پڑتا تھا، مورلینڈ کا خیال ہے کہ یہ صرف نمائشی قانون تھا،
اس نے ایک آرمینی تاجر کی مثال دی ہے کہ اس کا سامان چوری ہوگیا، تو کوتوال نے

اس کو ڈرا دھمکا کر معاوضے کا دعویٰ کرنے سے باز رکھا، ممکن ہے ایسی مثالیں بھی ہوں لیکن کوتوال کا افسر صوبہ دار ہوا کرتا تھا، اس لیے وہ ایسی حرکت اسی وقت کر سکتا تھا جب خود صوبہ دار اس کی چشم پوشی کرتا ہو جس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی، اور اس کی بھی مثال ہے کہ جب شقدار نے منزلیق اور اس کے ہمراہیوں کے ساتھ بدسلوکی کی تو کوتوال نے شقدار سے باز پرس کی، اور شقدار بڑی کوششوں کے بعد سزا سے بچ سکا، پھر بھی اس کو جرمانہ ادا کرنا پڑا، ایسی مثالیں بھی ہیں کہ اگر چوری سے کسی کا غیر معمولی نقصان ہو گیا تو بادشاہ وقت نے اس کا بڑا حصہ خود اپنی جیب سے ادا کیا، پولیس کے عہدیدار بادشاہ کی باز پرس سے بہت خوفزدہ اور ہراساں رہتے تھے، جس کا اعتراف خود مورلینڈ نے کیا ہے کہ جب ارمنی تاجروں سے بدسلوکی کا حال سورت کے صوبہ دار کو معلوم ہوا تو اس نے کوتوال کی یہ کہہ کر تنبیہ کی کہ اگر بادشاہ کو معلوم ہو جائے گا تو ہم سب کے لیے برا وقت آجائے گا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظام حکومت میں بے انصافی کا انسداد کرنے کی کوشش برابر جاری رہتی تھی۔

شہروں کی طرح مفصلات میں بھی امن برقرار رکھنے کا پورا انتظام قائم تھا، گاؤں کی پولیس کا انتظام فوجدار کے ذمے ہوتا تھا، وہ ضرورت کے مطابق تھانیدار اور سواروں کا ایک دستہ اپنے ماتحت رکھا کرتا تھا، ایک یورپین اہل قلم تھیونوٹ نے بھی اس کی تصدیق کی ہے کہ جس طرح شہروں کی پولیس کا نظم کوتوال کے ذمہ تھا، اسی طرح گاؤں میں امن و امان برقرار رکھنے کا ذمہ دار فوجدار ہوا کرتا تھا۔

مذکورہ بالا سطروں میں صرف عدل اور پولیس کے نظام کا ایک ہلکا سا خاکہ ہے، مغلوں کے پورے نظام سلطنت کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہوگا کہ

اس عہد میں ہندوستان کی حکومت دنیا کی شاندار حکومتوں میں سے ایک تھی، اور اس کی تمام معاصر حکومتوں میں اس سے زیادہ وسیع اور مستحکم کوئی اور حکومت نہ تھی، اور اس کے کارنامے صرف آرٹ اور کلچر ہی تک محدود نہیں تھے، بلکہ اس نے بڑی بڑی سیاسی شخصیتیں بھی پیدا کیں ہندو مسلمان دونوں کو متحد کیا، اس کی کارکردگی ایسی تھی، جس پر فخر کیا جا سکتا ہے، اٹھارہویں صدی عیسوی میں سرجان شور بہت بڑا مدبر گذرا ہے، جو حکومت کے نظم و نسق میں بڑا ماہر سمجھا جاتا تھا، اس کا بیان ہے کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی برسر اقتدار ہوئی، اس وقت صوبوں کے نظم و نسق میں ابتری تھی لیکن اس کا نظام جو تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کی حکومت استحکام اور دانشمندی کی مضبوط بنیاد پر قائم تھی جس میں مختلف فرقوں کے حقوق کی پوری حفاظت تھی، ہندوؤں کے لیے قوانین ان ہی کے بنائے ہوئے تھے، جن پر سختی سے عملدرآمد کرانے کی کوشش کی جاتی تھی، اور حکومت کی جتنی واجب الادا آمدنی ہوتی وہ وصول کر لی جاتی تھی،

مغلوں کا نظام حکومت ایک بڑا سیاسی تجربہ تھا جس کے اثرات موجودہ نظام حکومت میں بھی باقی ہیں، اس زمانے میں جو سیاسی تجربے ہوئے، اور ان میں جو کامیابی یا ناکامیابی ہوئی وہ آیندہ نسلوں کے لیے سیاسی وراثت بنی، اور سب سے بڑا سبق یہ حاصل ہوا کہ حکومت وہی قائم رہ سکتی ہے، جس کو لوگوں کا اعتماد اور محبت حاصل ہو، اور یہ دونوں چیزیں اسی وقت حاصل ہو سکتی ہیں، جب ملک میں امن اور خوشحالی ہو، اکبر نے اپنی پالیسی سے یہ سب کچھ کر دکھایا، لیکن جب اس کی پالیسی پر عمل نہیں کیا گیا تو حکومت کی بنیاد کمزور ہونے لگی، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس حکومت کی کامیابی حکمران کے تنہا اخلاق و کردار پر مبنی ہو، اس کی ترقی پائدار نہیں ہو سکتی، کیونکہ جب تک ایک اچھا حکمران،

اس وقت تک نظم و نسق اچھا رہ سکتا ہے، لیکن برے حکمراں کے آجانے سے سارے نظام میں انتشار و خلل پیدا ہو سکتا ہے، مغل حکومت اسی کا نمونہ ہے، اگرچہ ان مغلوں نے جو دیہی نظام قائم کیا تھا، اس سے لوگوں کو غیر معمولی فائدہ ہوا، اور اوپر کے نظم و نسق کی ابتری سے نیچے کے نظام میں کم سے کم خلل پڑا، اور عام طور سے لوگ پولیس کے مظالم سے محفوظ رہے، چوروں اور ڈاکوؤں سے ان کو کم سے کم نقصان پہنچتا، آپس کے جھگڑوں میں ان کے ساتھ مناسب انصاف کیا جاتا تھا، گاؤں کے مکھیا اور قانون گو ان کے حقوق کی پوری نگہداشت کرتے تھے، کسانوں اور کاشتکاروں کے لیے نہ ایسا نظام تھا اور نہ ماحول کہ وہ خواہ مخواہ تباہی اور بربادی کی طرف مائل ہوں، جیسا کہ موجودہ دور میں ہے کہ مہاجن ان کو قرض لینے کی ترغیب دلاتا ہے، وکلاء ان کو مقدمہ بازی کی طرف مائل کرتے ہیں، اور تاجر انکو فضول خرچی کے لیے آمادہ کرتے ہیں

"ص ع"

ادبیات

غزل

(از جناب اشفاق علیخاں صاحب، ایم اے آنرز، ال، ال، بی)

تعلق جن کو ایوانِ خرد سے ہے گدایانہ
وہ کیا جانیں کہ ہے طبعِ جنوں بھی کتنی شاہانہ

جنونِ شوق جن کو کھینچکر لایا کیا برسوں
ان ہی رندوں سے خالی ہو رہا ہے آج میخانہ

رہینِ زہد و تقویٰ ہو گئے اللہ کے بندے
کہیں مجھ سے بھی چھین جائے میرا ذوقِ رندانہ

مری انسانیت تجھ پر تصدق ہو یہ ناممکن
مرے شیخِ حرم مجھ سے نہ یوں پیش آ حریفانہ

ریاضِ آرزو اپنا بہار آنے سے پہلے ہی
دلِ خوں گشتہ کے ہاتھوں ہوا جاتا ہے ویرانہ

طریقے بادہ نوشوں کے بدلتے واعظِ دیں سے
مگر کیا کیجئے کامل نہ ہو جب پیرِ میخانہ

دیا کرتے ہیں اسرارِ حسینی درسِ حق کوشی
متاعِ دین و دولت ہو صدائے حق پسندانہ

خدایا پھر وہی جذبِ دروں دے نوجوانوں کو
جو کر دے مصلحت کوشی سے ان شیروں کو بیگانہ

اجازت ہو تو کر دوں فاش اب ان سادہ لوحوں پر
سکھائے ہیں جو تو نے مجھکو اسرارِ حکیمانہ

مری وحشت کو کیا سمجھے خرد کی مصلحت کوشی
کہ ہوں شمعِ شبستانِ حرا کا ایک پروانہ

تاثراتِ اختر

از جناب سید شاہ محمد منظور الرحمٰن صاحب اختر کاکوی

کیسی ہوائے تند گلستاں میں چل گئی — کلیوں کا روپ، پھولوں کی رنگت بدل گئی

کیا پوچھتے ہو عشق کی وارفتگی کا حال — اک موجِ بحر تھی کہ اٹھی اور مچل گئی

آئے مگر وہ آتے ہی فوراً چلے گئے — بجلی چمک کے دور نظر سے نکل گئی

ہر چند یاس نے تو کیا پائمالِ غم — صدقے میں آرزو کے طبیعت سنبھل گئی

آئی نسیم اور گلوں سے گلے ملی — کلیوں کو چھیڑ چھاڑ کے سن سے نکل گئی

سمجھے تھے ہم کہ یہ نگہ التفات ہے — اک آن میں امید کی دنیا بدل گئی

شاداب اپنے دل میں تھی اک شاخِ آرزو — وہ بھی خود اپنی آہ کی گرمی سے جل گئی

ذوقِ ادب، رہین تمنا و شوق تھا — حسرت نکل گئی تو طبیعت بدل گئی

فکرِ سخن، بہارِ چمن سے نہیں ہے کم — کچھ دیر کے لیے تو طبیعت بہل گئی

تدبیر نا خدا تھی کہ قدرت خدا کی تھی
اختر بھنور میں پڑ کے جو کشتی نکل گئی

نوائے حیات

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرینِ معارف اور دوسرے اصحابِ ذوق پوری طرح واقف ہیں، وہ دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن میں بہت سی نئی غزلوں اور نظموں کا اضافہ ہے، اور یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے۔ اس کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلمِ فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے۔ قیمت: مجلد للعہ۔ غیر مجلد ؎ ۔

منیجر

مطبوعاتِ جدیدہ

ذکرِ اقبال ۔ مؤلفہ جناب عبد المجید صاحب سالک تقطیع بڑی ضخامت ۲۹۶ صفحات، کاغذ عمدہ، ٹائپ خوبصورت قیمت مجلد صہ پتہ بزم اقبال نرسنگھ داس گارڈن کلب لاہور،

اقبال مرحوم کے علمی کمالات، ان کی شاعری، ان کے فلسفہ اور ان کی تعلیمات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، مگر ان کے سوانح اور ان کی دوسری علمی اور سیاسی خدمات پر ان متفرق واقعات کے سوا جو بعض مضامین میں ضمناً آ گئے ہیں، کوئی مستقل کتاب نہیں تھی، جس سے ان کی زندگی کے بہت سے واقعات عام نگاہوں سے مخفی ہیں، عام خیال یہ ہے کہ وہ ایک علمی اور فکری دنیا کے آدمی تھے، اور ان کو عملی کاموں سے کوئی تعلق نہ تھا، اور اس حیثیت سے یہ صحیح بھی ہے کہ عملی سیاست سے ان کو ذوق نہ تھا، اور وہ متعارف معنوں میں سیاسی لیڈر نہ تھے، لیکن ملکی سیاست سے بے تعلق بھی نہ تھے، اور ان کو ہندوستان کے سیاسی مسائل اور اس کی آزادی سے ایسی ہی دلچسپی تھی جیسی ایک محب وطن کو ہو سکتی ہے، مگر ان میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا احساس اور ان کی فلاح کا جذبہ اس قدر غالب تھا کہ ان کی سیاست زیادہ تر اسی دائرہ کے اندر محدود رہی، پنجاب کے مسلمانوں کی ہر تحریک میں تو وہ شریک ہی رہتے تھے، اس سے باہر بھی مسلمانوں کے اہم سیاسی مسائل سے وہ پوری دلچسپی رکھتے تھے اور اس میں حصہ لیتے تھے، اور ان کے علمی و ذہنی کمالات مختلف شعبوں میں ظاہر ہوتے تھے، جن سے ان کی زندگی کا کوئی صفحہ بھی خالی نہیں ہے، اس لیے ان کی سوانح عمری کی بڑی ضرورت تھی، یہ مسرت کا مقام ہے کہ یہ اہم کام انکے ایک

ایسے عقیدت مند کے ہاتھوں انجام پایا جو اپنے زور قلم اور اقبال مرحوم سے قریبی تعلقات کی بنا پر اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھے، ان کی حیثیت ان کے حالات میں عینی شاہد کی ہے، اس کتاب میں اقبال کی پیدایش سے لیکر ان کی وفات تک کے تمام اہم اور قابل ذکر کارناموں کی تفصیل ہے جس سے یہ پوری طرح ظاہر ہوجاتا ہے کہ شاعری کے ذریعہ مسلمانوں کی خدمت کے علاوہ سیاسی خدمات میں بھی انکا نمایاں حصہ رہا ہے خصوصاً ۱۹۳۰ء سے لیکر ۱۹۳۸ء تک جو ہندوستان خصوصاً مسلمانوں کی سیاست کا بڑا اہم دور تھا، ان کے حقوق اور مستقبل کے بارہ میں جس قدر معاملات و مسائل پیش آئے، اقبال نے ان سب میں پورا حصہ لیا، اور بعض معاملات میں رہنمائی بھی کی، ان واقعات کے ساتھ ان کے دوسرے کمالات اور متفرق دلچسپ واقعات کا بھی ذکر ہے جس سے مختلف شعبوں میں ان کے کارنامے اور ان کی عظمت نمایاں ہوجاتی ہے، اقبال کے استاد مولانا میر حسن اپنے دور کے بڑے صاحب کمال اور کامل گر تھے، اقبال کے علمی و اخلاقی کمالات میں ان کی تعلیم کو بڑا دخل تھا، اس لیے ایک باب میں ان کے مستقل حالات لکھے گئے ہیں، اس سرگذشت میں اقبال کے ابتدائی دور اور ان کے اسلوب زندگی کے حالات خاص طور پر دلچسپ اور ان کے اقوال و ملفوظات بڑے حکیمانہ اور سبق آموز ہیں، اقبال کے سوانح کے ضمن میں ہندوستان کے مسلمانوں کی چوتھائی صدی سے زیادہ کی سیاسی سرگذشت آگئی ہے، اس لیے اس کتاب کی حیثیت سوانح کے ساتھ تاریخ کی بھی ہے، مصنف کے قلم کی پختگی پوری کتاب میں نمایاں ہے،

افکار غالب - ازجناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب، تقطیع بڑی، ضخامت ۳۰۰ صفحے،
کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ؏، مکتبہ معین الادب اردو بازار، لاہور

غالب کا ذوق بڑا حکیمانہ و عارفانہ تھا، ان کی نگاہ نکتہ رس اور ان کے خیالات میں بڑی جدت و

ندرت تھی، اس لیے ان کے کلام میں جابجا کائنات و موجودات اور مختلف افکار و تصورات کے متعلق بڑے حکیمانہ اور دقیق خیالات پائے جاتے ہیں، جن کی جانب ان لوگوں کا خیال مشکل سے منتقل ہوسکتا ہے جو خود حکیمانہ ذوق اور عارفانہ نگاہ نہیں رکھتے، اس لیے جن شارحین نے انکے اردو دیوان کی شرح کے سلسلہ میں ایسے اشعار کی شرح کی ہے وہ بہت سطحی ہے، اور ان شروح میں ایسے اشعار کی تعداد بھی کم ہے، اور پھر فارسی کلام کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا ہے، فاضل مصنف کی فلسفہ دانی شہرت سے بے نیاز ہے، ان کی نظر مشرق و مغرب کے تمام فلسفوں پر ہے، اور طبیعات سے بھی وہ واقف ہیں، اس لیے انھوں نے افکار غالب میں غالب کے ان تمام اردو اور فارسی اشعار کی فلسفیانہ تشریح کی ہے، جن میں ان کے نزدیک کوئی حکیمانہ یا نادر خیال پایا جاتا ہے، اور وہ خود فلسفہ کے ماہر اور دقیقہ سنج ہیں، اس لیے انھوں نے فلسفیانہ نکتہ رسی اور اسکی عالمانہ تشریح کا پورا حق ادا کیا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ غالب کا مذاق فلسفیانہ تھا، اور اردو و کیا فارسی میں بھی اس مذاق کے شعرا کم نکلیں گے، لیکن یہ شرح غالب سے زیادہ خود فاضل شارح کی ذہنی جدت، ان کی دقت نظر اور فلسفہ دانی کا نمونہ ہے، اکثر اشعار کی فلسفیانہ تشریح تو بالکل صحیح اور بڑی حکیمانہ ہے، لیکن بہت سی ایسی تشریحیں بھی ہیں جنمیں غالب کے کسی نادر خیال کو محض قوت تحریر سے فلسفیانہ بنا دیا گیا ہے، اور کچھ ایسی بھی جن میں خالص عاشقانہ یا معمولی تخیل کو زبردستی فلسفیانہ بنا دیا گیا ہے، مگر اس افراط سے قطع نظر یہ کتاب صرف غالب کے فلسفیانہ اشعار کی شرح کی حیثیت سے بلند پایہ ہے، بلکہ مختلف فلسفیانہ افکار و تصورات قدیم و جدید فلسفوں بلکہ طبیعیات کے مسائل سے واقفیت اور دقت نظر پیدا کرنے کے لیے بھی بہت مفید ہے، اور اس سے مشرقی اور مغربی علوم میں مصنف کی وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے، اگرچہ اس کتاب کا موضوع نہایت خشک ہے، لیکن مصنف کے دلکش انداز تحریر

نے اس کو بہت خوشگوار اور دلچسپ بنا دیا ہے، اور وہ مختلف حیثیتوں سے اصحاب علم کے مطالعہ کے لائق ہے،

اساس عربی ۔ مولفہ پروفیسر نعیم الرحمن صاحب ایم اے تقطیع بڑی ضخامت ۳۲۸ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت عہ پتہ: نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، فریر روڈ، کراچی

عربی صرف و نحو کی پرانی کتابیں بہت طویل ہیں، اور ان کا طریقہ بھی پرانا ہے، گو فن میں کمال پیدا کرنے کے لیے وہ مفید ہیں، لیکن ان کی تعلیم میں بڑا وقت صرف ہوتا ہے، وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم کے لیے موزوں نہیں ہیں، بلکہ اب بہت سے عربی مدارس میں بھی صرف و نحو کی جدید طرز کی کتابیں رائج ہوگئی ہیں، اسی ضرورت کے پیش نظر محمد نعیم الرحمن صاحب لکچرار عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی نے عرصہ ہوا، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ..... عربی طلبہ کے لیے مشہور انگریزی نحوی تھیچر کی عربی گرامر کے طرز پر صرف و نحو میں یہ کتاب لکھی تھی، جو اسی زمانہ میں چھپ گئی تھی، اب اس کا دوسرا اڈیشن شائع ہوا ہے، مصنف اگرچہ جدید تعلیم یافتہ ہیں لیکن صرف و نحو کی قدیم کتابوں پر بھی ان کی پوری نظر ہے، اور انھوں نے اس کتاب کی تالیف میں ان سے فائدہ اٹھایا ہے، اس لیے اس میں صرف و نحو کے تمام ضروری مسائل آگئے ہیں، اور وہ عربی درسگاہوں اور یونیورسٹیوں دونوں کے طلبہ کے لیے کارآمد ہے،

تفسیر ابن کثیر اردو: تقطیع بڑی ضخامت ۴۰ صفحات، شائع کردہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب فریر روڈ، آرام باغ، کراچی، قیمت تحریر نہیں، اسی پتہ سے ملے گی۔

حافظ عماد الدین ابو الفداء دمشقی المعروف بہ ابن کثیر کی تفسیر جو انہی کے نام سے مشہور ہے، عربی کی بلند پایہ اور مستند تفسیر ہے، یہ مذکورہ بالا کتاب اسی کے بارھویں پارہ کا ترجمہ ہے، غالباً اس سے پہلے گیارہ پاروں کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے جو ہماری نظر سے نہیں گذرا، ترجمہ صاف اور سلیس ہے، مگر تفسیر ابن کثیر اور اس قسم کی دوسری تفسیریں درحقیقت تفسیری تحقیق کے کام کی ہیں، عام مسلمانوں کے لیے زیادہ کارآمد نہیں، البتہ درس قرآن اور تفسیر میں اس سے مدد لی جاسکتی ہے، اس حیثیت سے یہ ترجمہ مفید ہے،

جلد ۷۷ ماہ رجب المرجب ۱۳۷۵ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۵۶ء نمبر ۳

فہرست مضامین